جلد ۱۰۱ مارچ ۱۹۸۴ء عدد ۱

ماہنامہ

ترجمان القرآن

موسس

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ تعالیٰ

ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

فہرست مضامین

جلد ۱۰۱ | مارچ ۱۹۸۴ء مطابق جمادی الاخریٰ ۱۴۰۴ھ | عدد ۱

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵۔ اے ذیلدار پارک، اچھرہ۔ لاہور

فون نمبر ——— ۴۱۰۳۱۶

زرِ سالانہ تیس روپے۔ فی پرچہ ۔/۳ روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایچ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

پہلے انتخاب نوّے دن کے اندر اندر ـــــ پھر حالات کی درستی اور احتساب کے لیے التوا ـــــ پھر اسلام کے نفاذ کے لیے مزید التوا ـــــ پھر یہ بحث کہ نظامِ مملکت کیسا ہو؟ صدارتی[1] یا پارلیمانی؟ انتخابات کس طریق پہ ہوں؟ مغربی جمہوریت کے تحت یا اسلامی[2] جمہوریت کے مطابق؟ ۱۹۸۴ء میں یا ۱۹۸۵ء میں؟ سیلیکشن کی شکل میں یا الیکشن ہی کی صورت میں؟ اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ کے مطابق یا انصاری کمیشن کی سفارشات کے مطابق؟

---

[1] کبھی لکھنے والا آدمی سخت کڑھتا ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ کسی اہم معاملے میں اس کی محنت رائیگاں گئی۔ ایوب صاحب کے دور میں جب صدارتی نظام کا غلغلہ شروع ہوا تو راقم نے ایک مختصر کتاب "امریکہ کا صدارتی نظام" لکھ کر یہ واضح کیا کہ وہ نظام اپنے مخصوص فطری احوال میں پروان چڑھا اور پھر اس کے اندر تقسیم اختیارات اور اداروں میں "مزاحمتوں اور توازنات" کے ضابطے ایسے پیچیدہ ہیں کہ ہمارے ملک کی ذہنی سطح اس کو برداشت نہیں کر سکتی، اور اگر اسے نافذ کر بھی دیا جائے تو ایک شاندار قسم کی جمہوریت نما آمریت وجود میں آسکتی ہے۔ اب اسے کون پڑھے اور کیوں پڑھے؟

[2] غالباً یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ اسلامی جمہوریت میں جمہوریت نہیں ہوتی۔ جو سلطان بن گیا بس وہ خداوند قرار پایا۔ کم سے کم بنو اُمیہ اور بنو عباس کے دور میں ایسا ہی سمجھا گیا اور اسی کے مطابق برتاؤ کیا گیا اور پھر اسی کے مطابق وہ دردناک نتائج بھگتنے پڑے جن سے ہماری تاریخ کے اوراق آج بھی لہو سے رنگین ہیں۔ اور ہماری جبینوں پہ ذلت کے داغ لگے رہ گئے ہیں۔

گو مگو اور حیص بیص کی یہ رسّی اتنی دراز ہوتی چلی جا رہی ہے کہ کسی کے لیے اب یہ توقع کرنا عبث ہے کہ یہاں کبھی انتخابات ہوں گے اور ہوں گے تو کب ہوں گے نیز کس شان کے ہوں گے۔

مزید ستم یہ کہ اسلام اسلام پکارنے والی حکومت تمام ان حقوق کو اس ملک میں یکے بعد دیگرے مسلسل ملیا میٹ کرتی جا رہی ہے جو اللہ کی طرف سے طے، رسولِ برحق صلی اللہ علیہ وسلم کی جناب سے مسلّمہ اور بندگانِ خدا سے بالکل غیر منفک ہیں۔ کوئی پارلیمنٹ، کوئی وزیر، کوئی صدر اور کوئی محکمہ یا ادارہ ان میں سے کسی حق کو من مانے طریق پر یک طرفہ سلب نہیں کر سکتا۔ نہ کوئی صاحبِ اقتدار کسی صاحبِ حق کو اپنے حق سے محرومی کے خلاف عدالت سے رجوع کرنے سے روک سکتا ہے بلکہ کسی بڑی سے بڑی عدالت کا جج بھی محض ذاتی صوابدید پر یا حکومت کو خوش کرنے کے لیے شریعت سے بے نیاز ہو کر اور غیر اسلامی عدالتی نظاموں کے نظائر کا سہارا لے کر، خدا و رسولؐ کے خلاف فیصلہ دینے کا مجاز نہیں ہے۔

ان میں سے آزادیٔ اظہار کا حق بے حد اہمیت رکھتا ہے، اسی طرح آزادیٔ اجتماع کے حق کو سلب نہیں کیا جا سکتا۔ نہ کسی کو بلا ثبوت جرم گرفتار رکھا جا سکتا ہے۔ کسی کو نظر بند کرنے کے لیے واضح وجوہ ہونے چاہئیں، جنہیں کوئی شخص چاہے تو عدالت میں لے جا سکے۔ اسی طرح ایک اسلامی حکومت کا یہ بنیادی فریضہ ہے کہ اپنے عوام کو جان و مال، عزت اور آبرو کا تحفظ فراہم کرے لیکن ہمارے ہاں یہ حقوق پامال ہوتے چلے آ رہے ہیں اور ان کی پامالی مسلسل بڑھ رہی ہے۔ اور اس بارے میں خود حکام کی کارکردگی انتہائی پست بلکہ شرمناک ہے۔ وہ جرائم پیشہ لوگوں کے مقابلے میں بے بس ہو رہے ہیں۔

کیا یہ حالات بحالیٔ جمہوریت اور انعقادِ انتخابات[1] اور نفاذِ اسلام کے حالات ہیں۔

---

[1] پہلے بات کو ٹالتے ٹالتے معاملہ یہاں پہنچا تھا کہ کم سے کم صوبائی انتخابات اکتوبر ۱۹۸۴ء میں کرائے جائیں گے، آج (۲۰ فروری) کا تازہ اخباری نشریہ بتاتا ہے کہ ہر دو سطح کے انتخابات مارچ ۱۹۸۵ء تک ہوں گے۔

اس گفتگو سے تھوڑا سا ہٹ کر ہم یہ بھی ذکر کرنا چاہتے ہیں کہ اس دوران میں امریکہ بھی اپنا کوئی منصوبہ رکھتا ہے اور اُسے عمل میں لانا چاہتا ہے۔

ترقی پذیر ممالک ـــــــ خصوصاً مسلم ممالک کے متعلق اس کی پالیسی یہ ہے کہ ان کو سیاسی استحکام حاصل کرنے سے روکے جس پر ساری قوت اور ترقی کا دارومدار اور عالمی اثر و رسوخ کا انحصار ہے۔ اس نے ایف ۱۶ اگرچہ ہمیں بھاری شرح سود پر قرض کے طور پر دیئے ہیں مگر اس "امداد" کی بھی وہ پوری قیمت وصول کرنا چاہتا ہے۔ ہم مختلف مُلکوں کے احوال کو گنوا نہیں سکتا، مگر دُنیا کے نقشے پر ایسی بے شمار شہادتیں موجود ہیں کہ آزاد مسلم ملکوں کو اس نے ایک خاص طرح بے بس کر رکھا ہے، اور کمزور مسلم ممالک اور مخلوط عیسائی اور مسلم آبادی والے ممالک میں (جہاں اکثریت مسلمانوں کی ہے) وہ مسلمانوں کے قتلِ عام اور ان کی تباہی اور سیاسی محرومی اور معاشی بدحالی کی پشت پناہی کر رہا ہے۔ نیز آسام اور بھارت کے دوسرے علاقوں میں مسلمانوں کی جو نسل کُشی ہو رہی ہے، اس پر اس نے بین الاقوامی اسٹیج سے بھی کبھی آواز بلند نہیں کی اور نہ کبھی آواز بلند کرنے والوں کی ہمت افزائی کی ہے۔ اِدھر خصوصاً ایک تو ایران کے تلخ ترین تجربے کے بعد جہاں کے انقلاب نے اس کے ساتھ وہ سلوک کیا جیسے کسی سانپ کی گردن پکڑ کر اسے زمین پر مسلسل رگڑا جاتا ہے، دوسرے لبنان میں مسلمانوں کی تباہی کے لیے اسرائیلی اسلحہ و سپاہ کی بھاری اور وحشیانہ قوت پہلے ہی موجود تھی۔ امریکہ اپنی قوت بھی بڑے طنطنے سے اس کی پشت پناہی کے لیے لے کے پہنچا مگر رہی سہی عزت خاک میں مل گئی۔ اسرائیل کے بعد مصر کھلم کھلا کیمپ ڈیوڈ سمجھوتے کے حلقے توڑ چکا ہے، لہٰذا اب امریکہ افغانیوں کو تھپکی اور خیرات دینے کے ساتھ ساتھ اس پر خوش ہے کہ دُنیا کی ایک بہادر ترین اسلامی قوم اور اس کا وطن تباہی کا شکار ہو رہے ہیں۔ اور اس تباہ شدہ قوم کو ایک وقت وہ رُوس سے مل کر اس پر مجبور کر دے گا کہ اسلامیت کے موقف کو چھوڑ کر وہ ایک نیم لادین، نیم اشتراکی حکومت پر راضی ہو جائیں (خدا کرے کہ ایسا نہ ہو!)

اِدھر دوسری طرف اس نے ہمیں ایف ۱۶ دے کر جو احسانِ عظیم فرمایا ہے۔ اس کا حساب برابر کرنے کے لیے وہ بھارت کو (جہاں رُوس نے پہلے ہی قسم قسم کے اسلحہ کے انبار لگا دیئے ہیں)

ایف ۲۰ طیارے دے رہا ہے، بلکہ اُن کی ٹیکنالوجی بھی، تاکہ خود بھارت ہی یہ طیارے تیار ہونے لگیں۔ اس سے ذرا اُس دوستی اور نوازش کا اندازہ کیجیے جس سے ہمیں بہرہ مند فرمایا گیا ہے۔

وہ ہمارے مسلم قوم ہونے کی سزا ہمیں ضرور دے گا۔

اِس وقت امریکہ اپنی صہیونی ڈپلومیسی کے زیرِ اثر جو دوسری کارروائی کرنے کے درپے ہے، وہ یہ ہے کہ پاکستان کو سیاسی استحکام اور تسلسل سے محروم کر دے، معاشی ترقی اور ایٹمی خودکفالتی اسے حاصل نہ ہو، اس کے عوام اور حکمرانوں میں فاصلہ بڑھے، اس میں اسلام کے اُبھرنے کے امکانات اور ان کے محرکات کو کم کیا جائے، اور انتشار اور مایوسی کی ایسی فضا پیدا کر دی جائے (یہ کام خاصا ہو چکا ہے) کہ اُوپر ہی اُوپر کوئی ایسی تبدیلی لائی جا سکے جو پاکستان کو نہ اِدھر کا چھوڑے، نہ اُدھر کا![1]

اور یہاں پہلے یہ ہو ہی چکا تھا کہ تمام سیاسی پارٹیاں کالعدم، متعدد لیڈر نظر بند، بہت سے لیڈروں کے لیے ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں داخلہ ممنوع، اخبار کی رگ ہائے گلو پر نشتر، ان میں سے کسی سے کوئی گفتگو نہیں، کسی سے افہام و تفہیم نہیں اور اب تازہ قدم یہ اُٹھایا گیا ہے کہ اسلامی رجحان کے طلبہ کی بڑھتی ہوئی قوت کو عالمِ بالا کے ذوقِ فروغِ اسلام نے بڑے خطرے کی نظر سے دیکھا، اور اس اکثریتی عنصر کی قوت کو درس گاہوں میں ختم کرنے کے لیے بظاہر ساری یونینوں پر پابندی لگا دی۔ یہ پابندی مارشل لا کے ایک ایسے حکم سے لگائی گئی ہے جس کے تحت درس گاہوں کے پرنسپلوں اور وائس چانسلروں کو بھی مارشل لا ایڈمنسٹریٹر

---

[1] واضح رہے کہ امریکہ ہر زیرِ اثر ملک کے لیڈروں، جرنیلوں اور بیوروکریٹس میں کام کے آدمیوں کی ایک فہرست تیار رکھتا ہے اور جب ضرورت ہوتی ہے کسی کے کان میں سرگوشی کرنے کی راہیں نکال لیتا ہے، اعداد و شمار جمع کرتا ہے، مؤثر قوتوں کو دبانے کے لیے دلکش منصوبے تیار کرتا ہے۔ معاملہ افراد ہی کا نہیں، راجہ منور اور ڈاکٹر افضل جیسے لوگوں کے پیچھے وہ گروہ ہے جو پہلے انگریز کا خود کاشتہ پودا تھا اور اب اس کی جڑیں اسرائیل اور امریکہ تک پہنچی ہیں۔

جیسے اختیارات کے پستولوں سے مسلح کر دیا گیا ہے۔ افسوس کہ دنیا کے ایسے تجربات سے ہمارے بزرگ آشنا نہیں کہ جہاں تعلیم گاہوں میں اسلامی رجحان کے طلبہ کو دبایا گیا ہے وہاں پھر لازماً لادین اور کمیونسٹ عناصر حکمران بن جاتے رہے ہیں۔ یہاں ابھی سے "ڈسکو ڈانس" کے ریکارڈ ہوسٹلوں میں اور مجالس میں بجنے شروع ہو گئے ہیں۔ اس سے پہلے ایک تجربہ مصر نے کیا تھا۔ اور اس کے نتائج بد اُسے بھگتنے پڑے۔ دوسرا تجربہ صدر نمیری صاحب کا تھا جو اُدھر کا سارا مزہ چکھ کر پھر اسی نتیجے پر پہنچے کہ طلبہ کی اسلامی قوت کا کارفرما ہونا ضروری ہے۔ کابل یونیورسٹی پر یہ تاریک دور گذر چکا ہے کہ وہاں کوئی مسلمان طالب علم نماز پڑھنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ آخر دو چار نوجوانوں نے خفیہ مشورے کے بعد آہستہ آہستہ زیر سطح کام کرنا شروع کیا، جس کے نتیجے میں پھر وہاں کمیونسٹوں کے لیے سر اُٹھانے کا موقع ختم ہو گیا، تا آنکہ تحریک جہاد شروع ہو گئی۔

یقیناً یہاں امریکہ کی تمنائے مخفی کی تکمیل ہو گئی ہے کہ پہلے احیائے اسلام کی علمبردار جماعتیں زیر پابندی تھیں اور اب مسلم نوجوان قوت پر بھرپور وار کر دیا گیا ہے۔

طلبا کے خلاف اس اقدام نے ملک کے اندر اور باہر عالم اسلام میں اہلِ دین کو سخت مضطرب کر دیا ہے[1]۔ آخر یہ اپنی قوم کے جگر گوشے اور اس کی امیدوں کے مرکز ہیں۔ ان کی یہ عظیم الشان خدمات ناقابلِ فراموش ہیں کہ انہوں نے نئے آنے والے ساتھیوں کو اسلام کی دعوت دی، ان کو نماز[2]

---

[1] ہم یہ سوچتے رہے کہ کہیں حالات کا کوئی مدوجزر انتخابات کو ٹالنے کا بہانہ نہ بن جائے، کسی سیاسی مدوجزر کی وجہ سے دشمنوں میں گھرے ہوئے ملک کا نقصان نہ ہو اور کوئی غیر ملکی فتنہ پھیل نہ سکے۔ اسے ہماری کمزوری سمجھ لیا گیا ہے اور اس کمزوری سے اب ناجائز فائدہ اُٹھایا جانے لگا ہے۔

[2] اتنے نمازی تو مارشل لا حکومت کے فرمانِ اقامتِ صلوٰۃ سے بھی پیدا نہ ہو سکے ہوں گے۔

اور اخلاق کا پابند کیا اور پھر لادین اور کمیونسٹ مفاد پرست منافقوں کو اپنی اکثریت سے اس طرح دبا دیا کہ وہ اکثر مقامات پر تیرہ تیرہ گروپوں سے مل کر انتخابی مقابلے میں اسلامی قوت سے شکست کھا گئے۔

ان پر اب جو وار ہوا ہے، ہم سب اور پوری قوم کے دل اس سے مجروح ہوئے ہیں۔ ان کا دکھ ہمارا دکھ ہے، ان کا کرب ہمارا کرب ہے۔ یہ تو ناقابلِ برداشت ہے کہ ان کے ساتھ جو بھی ذلیل سے ذلیل سلوک روا رکھا جائے اس پر کسی طرف کوئی احساسِ کرب ہی نمودار نہ ہو۔

یہ قدرتی بات تھی کہ ایک وسیع نوجوان قوت کو آپ اچانک پوری طرح ملیامیٹ کرنے کا اقدام کریں تو اس پر بے اختیارانہ ردّعمل نہ ہو۔ یہ کیسے فرض کیا گیا کہ ہر طرف سے نوجوانوں کی قطاریں سر جھکا کر آمنّا وصدّقنا کہ دیں اور جشن منائیں یا سناٹا چھایا رہے۔ حکام چاہتے تو اس فطری ردِّعمل کا لحاظ کرتے ہوئے قدرے نرمی اور ملاطفت سے کام لیتے اور کچھ لوگوں کے لیے ممکن ہوتا کہ وہ ان کو صبر و ضبط کی تلقین کرتے۔ مگر ابتدا ہی سے نہایت سخت گیری سے کام لیا گیا۔ جس کو چاہا پکڑا اور جسے چاہا یونیورسٹی یا کالج سے نکال دیا۔ اور اس مہم میں بڑی پھرتی اور تیزی دکھائی گئی۔ بلکہ ایسی صورتیں بھی علم میں آئیں کہ اوپر سے کچھ طلبا کے نام لے کر پرنسپلوں کو کہا گیا کہ ان کو نکالو یا رپورٹ کر کے گرفتار کراؤ۔ اکا دکا مثال ایسی بھی ہے کہ کسی پرنسپل نے اوپر والوں سے کہا کہ ان لڑکوں کا کوئی جرم ہی نہیں اور انہوں نے کوئی ایسی کارروائی ہی نہیں کی جس پر میں اقدام کروں تو اسے کہا گیا کہ اچھا پھر گریڈ اور سکیل کے لحاظ سے ایک درجہ نیچے جانا ہوگا۔ اس باضمیر نے اس کو قبول کر لیا۔

پکڑ دھکڑ ہوا ہی کرتی ہے، مگر اس میں ایک تو جرم کرنے اور نہ کرنے والوں میں فرق کیا جانا لازم ہے، دوسرے اگر پولیس کسی جرم میں جس نوجوان کو لے جائے، چاہیے کہ اس کا ریکارڈ کسی عدالت کے سامنے پیش کرے اور اسے قانون کے مطابق سزا دلوائے۔ مگر یہاں تو یہ حال ہوا ہے کہ تھانوں اور حوالات میں لے جا کر طلبہ کو نشانۂ عقوبت بنایا گیا ہے۔ معاملہ یہیں ختم نہیں ہوتا بلکہ گوجرانوالہ میں ایک لڑکے کو ننگا کر کے اس کے موئے زہار کو دیا سلائیوں سے

جلایا گیا اور اُس کی چیخیں ساتھ کے کمرے میں مقفّل ہوئے حوالاتیوں نے سُنیں۔ پھر زیرِ تفتیش بدمعاشوں سے کہا گیا کہ کوئی ہے جو چل کر اس کے ساتھ حرکتِ شنیعہ کا ارتکاب کرے۔ اس پر سب نے انکار کیا تو پولیس والوں نے کہا کہ اچھا اس ننگ کام کا انتظام بھی ہم کو خود ہی کرنا ہوگا۔ یہ ہیں نفاذِ قانون اور لوگوں کے جان و مال و آبرو کے محافظ جن کی حرکات خدا کے غضب کو بھڑکانے کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔ کیا ایسے انبارِ غلاظت کے ہوتے ہوئے اس پر اسلام کا بورڈ لگانا سجتا ہے؟ کیا ایسے کارندوں کا نوٹس لینے والا کوئی ہے؟ کیا انہیں شریعت کے مطابق سزا دینے کی قوت مارشل لا کے بازوؤں میں ہے۔

کیا تم لوگ آنکھوں سے دیکھ نہیں رہے کہ تمہارے شمال اور جنوب میں دو قوتیں قدرت نے ایسی کھڑی کر رکھی ہیں کہ اگر وہ تمہارے کرتوتوں کی وجہ سے انہیں ڈھیل دے دے تو نہ عہدے رہیں گے، نہ عمارتیں اور نہ دولت کے انبار۔ پھر کیا تم ڈرتے نہیں! کیا اُس وقت تم کو ڈاکٹر افضل پناہ دے گا؟

یہ سارے احوال ڈاکٹر افضل کے پیدا کردہ ہیں، خدا را قوم کو اس سے نجات دلوائیے۔

موجودہ بے بسی کی حالت میں میرے دل سے بے اختیار یہ دُعا اُٹھتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے ناپاک لوگوں سے اس ملک کو پاک کرے۔ اس طرح کی حرکات کے جو مرتکب ہوں اور ان حرکات کی ذمہ داری جہاں جہاں تک جس جس درجے میں جاتی ہو ایسے تمام لوگوں کو ان کے حصّے کے مطابق اللہ تعالیٰ اپنی گرفت میں لے کر دنیا میں بھی سامانِ عبرت بنائے اور آخرت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے محروم رکھے۔ میں چاہتا ہوں کہ ایک دن میں اپنے گھر کے تمام لوگوں سے کہوں کہ وہ نوافل ادا کریں اور قرآن پڑھ کر بھی دُعا مانگیں، بلکہ مُلک بھر میں جو اسلام پسند گھرانے موجود ہیں ان سب میں ایسا ایک دن منایا جانا چاہیے۔

یہ دُعا بھی کیجیے کہ خدا ڈاکٹر افضل سے اور اس کے مشورے سے نافذ شدہ مارشل لا آرڈر سے قوم کو نجات دلائے۔

طلبہ کی یونینوں کو ختم کرنے کے بعد میرا خیال ہے کہ ٹریڈ یونینوں کو بھی ختم کر دیا جائے گا اور

جب ملک سیاسی طور پر پوری طرح ایک قبرستان بن جائے گا تو کسی خاص طرح کے نام نہاد انتخابات کرا لیے جائیں گے اور ان کے لیے جبری ووٹ (بزور قانون) حاصل کیے جائیں گے۔ کیونکہ عوام کی رغبت تو ختم ہوتی جا رہی ہے۔ ان حالات میں دوسروں پر تو میرا اختیار نہیں لیکن اگر قانون کے دباؤ سے مجھے مجبور نہ کیا گیا تو آج سے میرا ضمیر کسی ایسے شخص یا ادارے کو ووٹ دینے کے لیے تیار نہیں جس کا مقصد کسی خاص اقتدار کو طول دینا ہو یا کسی خاص طرح کی آمریت (بہ پردہ جمہوریت سہی) قائم کرنا مطلوب ہو۔

اتنا کہہ دینا اتمام حجت کے لیے ضروری ہے کہ جو حکومت نہ لیڈروں سے بات بنا سکے، نہ پارٹیوں سے افہام و تفہیم کرنے پر تیار ہو، نہ کسی مؤثر تنظیم کا (خواہ وہ اسلامی ہو) وجود گوارا نہ کر سکے، وہ اگر ووٹ لیے بغیر یا ووٹ لے کر بھی اقتدار کا دوام چاہے تو ایسا نہ پہلے کبھی ہوا نہ آئندہ ہو سکے گا، حتیٰ کہ خود پاکستان کے گذشتہ تجربات بھی میری اس گذارش کی تائید کریں گے۔

آپ قوم کی ہر مؤثر قوت کو اگر "پریشر ککر" میں ڈال کر جبریت کی آنچ دیں گے اور بھاپ نکلنے کے راستے بھی بند کر دیں گے تو یہ پریشر ککر اس بری طرح پھٹے گا کہ پھر کسی کی خیر نہیں۔

محض اسلام اسلام کی رٹ ایسے حادثوں سے قوموں کو نہیں بچا سکتی۔

ہے کوئی سوچنے اور سبق لینے والا!

مدیر ترجمان القرآن کا پتہ

نعیم صدیقی —— منصورہ —— ملتان روڈ، لاہور ۱۸

فون:- ۴۳۰۰۳۲ —— ۴۳۰۰۳۳ —— ۴۳۱۰۹۱

حکمتِ سیّد مودودیؒ

شرک و توحید کا فرق اور توحید کا صحیح تصوّر

اقتباس کردہ۔ محمد یوسف صاحب ناظم لائبریری۔ ادارہ معارف اسلامی منصورہ لاہور

اللہ تعالیٰ نے شرک اور توحید کے فرق اور انسان کی زندگی پر دونوں کے اثرات کو اس طرح کھول کر بیان فرما دیا ہے کہ اس سے زیادہ مختصر الفاظ میں اتنا بڑا مضمون اتنے مؤثر طریقے سے سمجھا دینا ممکن نہیں ہے۔ یہ بات ہر آدمی تسلیم کرے گا کہ جس شخص کے بہت سے مالک یا آقا ہوں، اور ہر ایک اُس کو اپنی اپنی طرف کھینچ رہا ہو، اور وہ مالک بھی ایسے بدمزاج ہوں کہ ہر ایک اُس سے خدمت لیتے ہوئے دوسرے مالک کے حکم پر دوڑنے کی اُسے مہلت نہ دیتا ہو اور اُن کے متضاد احکام میں جس کے حکم کی بھی وہ تعمیل سے قاصر رہ جائے وہ اسے ڈانٹنے پھٹکارنے ہی پر اکتفا نہ کرتا ہو بلکہ سزا دینے پر تُل جاتا ہو۔ اس کی زندگی لامحالہ سخت ضیق میں ہوگی۔ اور اس کے برعکس وہ شخص بڑے چین اور آرام سے رہے گا جو بس ایک ہی آقا کا نوکر یا غلام ہو اور کسی دوسرے کی خدمت و رضا جوئی اسے نہ کرنی پڑے۔ یہ ایسی سیدھی سی بات ہے جسے سمجھنے کے لیے کسی بڑے غور و تامل کی حاجت نہیں ہے۔ اس کے بعد کسی شخص کے لیے یہ سمجھنا بھی مشکل نہیں رہتا کہ انسان کے لیے جو امن و اطمینان ایک خدا کی بندگی میں ہے وہ بہت سے خداؤں کی بندگی میں اُسے کبھی میسر نہیں آسکتا۔

اس مقام پر یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ بہت سے کج خلق اور باہم متنازع آقاؤں کی تمثیل پتھر کے بتوں پر راست نہیں آتی بلکہ اُن جیتے جاگتے آقاؤں پر ہی راست آتی ہے

جو عملاً آدمی کو متضاد احکام دیتے ہیں اور فی الواقع اُس کو اپنی اپنی طرف کھینچتے رہتے ہیں۔ پتھر کے بُت کسی کو حکم دیا کرتے ہیں اور کب کسی کو کھینچ کر اپنی خدمت کے لیے بلاتے ہیں۔ یہ کام تو زندہ آقاؤں ہی کے کرنے کے ہیں۔ ایک آقا آدمی کے اپنے نفس میں بیٹھا ہوا ہے جو طرح طرح کی خواہشات اُس کے سامنے پیش کرتا ہے اور اُسے مجبور کرتا رہتا ہے کہ وہ انہیں پورا کرے۔ دوسرے بے شمار آقا گھر میں، خاندان میں، برادری میں، قوم اور ملک کے معاشرے میں، مذہبی پیشواؤں، حکمرانوں اور قانون سازوں میں، کاروبار اور معیشت کے دائروں میں، اور دُنیا کے تمدن پر غلبہ رکھنے والی طاقتوں میں ہر طرف موجود ہے، جن کے متضاد تقاضے اور مختلف مطالبے ہر وقت آدمی کو اپنی اپنی طرف کھینچتے رہتے ہیں۔ اور ان میں سے جس کا تقاضا پورا کرنے میں بھی وہ کوتاہی کرتا ہے وہ اپنے دائرہ کار میں اس کو سزا دیے بغیر نہیں چھوڑتا۔ البتہ ہر ایک کی سزا کے ہتھیار الگ الگ ہیں۔ کوئی دل مسوستا ہے، کوئی روٹھ جاتا ہے، کوئی نکو بناتا ہے، کوئی مقاطعہ کرتا ہے۔ کوئی دیوالہ نکالتا ہے۔ کوئی مذہب کا وار کرتا ہے اور کوئی قانون کی چوٹ لگاتا ہے۔ اس ضیق سے نکلنے کی کوئی صورت انسان کے لیے اس کے سوا نہیں ہے کہ وہ توحید کا مسلک اختیار کر کے صرف ایک خدا کا بندہ بن جائے۔ اور ہر دوسرے کی بندگی کا قلادہ اپنی گردن سے اُتار پھینکے۔

توحید کا مسلک اختیار کرنے کی بھی دو شکلیں ہیں جن کے نتائج الگ الگ ہیں۔

ایک شکل یہ ہے کہ ایک فرد اپنی انفرادی حیثیت میں خدائے واحد کا بندہ بن کر رہنے کا فیصلہ کر لے اور گرد و پیش کا ماحول اس معاملے میں اس کا ساتھی نہ ہو۔ اس صورت میں یہ تو ہو سکتا ہے کہ خارجی کش مکش اور ضیق اس کے لیے پہلے سے بھی زیادہ بڑھ جائے، لیکن اگر اُس نے سچے دل سے یہ مسلک اختیار کیا ہو تو اسے داخلی امن و اطمینان لازماً میسّر آ جائے گا۔ یہ نفس کی ہر اُس خواہش کو رد کر دے گا جو احکامِ الٰہی کے خلاف ہو یا جسے پورا کرنے کے ساتھ خدا پرستی کے تقاضے پورے نہ کیے جا سکتے ہوں۔ وہ خاندان، برادری، قوم، حکومت، مذہبی پیشوائی اور معاشی اقتدار کے بھی کسی ایسے

مطالبے کو قبول نہ کرے گا جو خدا کے قانون سے ٹکراتا ہو۔ اس کے نتیجے میں اُسے بےحد تکلیفیں پہنچ سکتی ہیں، بلکہ لازماً پہنچیں گی۔ لیکن اس کا دل پوری طرح مطمئن ہوگا کہ جس خدا کا میں بندہ ہوں اس کی بندگی کا تقاضا پورا کر رہا ہوں، اور جن کا بندہ میں نہیں ہوں اُن کا مجھ پر کوئی حق نہیں ہے جس کی بنا پر میں اپنے رب کے حکم کے خلاف اُن کی بندگی بجا لاؤں۔ یہ دل کا اطمینان اور رُوح کا امن و سکون دُنیا کی کوئی طاقت اُس سے نہیں چھین سکتی۔ حتیٰ کہ اگر اسے پھانسی پر بھی چڑھنا پڑ جائے تو وہ ٹھنڈے دل سے چڑھ جائے گا اور اس کو ذرا پچھتاوا نہ ہوگا کہ میں نے کیوں نہ جھوٹے خداؤں کے آگے سر جھکا کر اپنی جان بچا لی۔

دوسری شکل یہ ہے کہ پورا معاشرہ اِسی توحید کی بنیاد پر قائم ہو جائے اور اس میں اخلاق، تمدن، تہذیب، تعلیم، مذہب، قانون، رسم و رواج، سیاست، معیشت، غرض ہر شعبۂ زندگی کے لیے وہ اُصول اعتقاداً مان لیے جائیں اور عملاً رائج ہو جائیں جو خداوند عالم نے اپنی کتاب اور اپنے رسولؐ کے ذریعے سے دیئے ہیں۔ خدا کا دین جس کو گناہ کہتا ہے، قانون اسی کو جرم قرار دے، حکومت کی انتظامی مشین اسی کو مٹانے کی کوشش کرے، تعلیم و تربیت اسی سے بچنے کے لیے ذہن اور کردار تیار کرے، منبر و محراب اسی کی تلقین کریں ———، معاشرہ اسی کو معیوب ٹھیرائے اور معیشت کے ہر کاروبار میں وہ ممنوع ہو جائے۔ اسی طرح خدا کا دین جس چیز کو بھلائی اور نیکی قرار دے، قانون اس کی حمایت کرے، انتظام کی طاقتیں اسے پروان چڑھانے میں لگ جائیں، تعلیم و تربیت کا پورا نظام ذہنوں میں اس کو بٹھانے اور سیرتوں میں اُسے رچا دینے کی کوشش کرے، منبر و محراب اسی کی تلقین کریں، معاشرہ اسی کی تعریف کرے اور اپنے عملی رسم و رواج اُس پر قائم کر دے، اور کاروبارِ معیشت بھی اُسی کے مطابق چلے۔ یہ وہ صورت ہے جس میں انسان کو کامل داخلی و خارجی اطمینان میسر آجاتا ہے اور مادی و روحانی ترقی کے تمام دروازے اس کے لیے کھل جاتے ہیں، کیونکہ اس میں بندگیٔ رب اور بندگیٔ غیر کے تقاضوں کا تصادم قریب قریب

ختم ہو جاتا ہے۔

اسلام کی دعوت اگرچہ ہر ہر فرد کو یہی ہے کہ خواہ دوسری صورت پیدا ہو یا نہ ہو، بہر حال وہ توحید ہی کو اپنا دین بنا لے اور تمام خطرات و مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے اللہ کی بندگی کرے۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام کا آخری مقصود یہی دوسری صورت پیدا کرنا ہے اور تمام انبیاء علیہم السلام کی کوششوں کا مدعا یہی رہا ہے کہ اُمتِ مسلمہ وجود میں آئے جو کفر اور کفار کے غلبے سے آزاد ہو کر من حیث الجماعت اللہ کے دین کی پیروی کرے۔ کوئی شخص جب تک قرآن و سنّت سے ناواقف اور عقل سے بے بہرہ نہ ہو، یہ نہیں کہہ سکتا کہ انبیاء علیہم السلام کی سعی و جہد کا مقصود صرف انفرادی ایمان و طاعت ہے، اور اجتماعی زندگی میں دینِ حق کو نافذ و قائم کرنا سرے سے ان کا مقصد ہی نہیں رہا ہے۔

حامدی صاحب کے تحریکی سفر کی داستان

(بہ شکل خطوط بنام قاری منہاج الدین صاحب)

از مولانا خلیل حامدی ڈائریکٹر ادارۂ معارفِ اسلامی منصورہ لاہور

(۳)

ماریشس کی ڈائری پہلے تین قسطوں میں بھیج چکا ہوں۔ درمیان میں اسمرا (اریٹیریا) میں اپنے مختصر قیام پر مشتمل ایک خط بھیج چکا ہوں۔ امید ہے مل گیا ہوگا۔ اب ماریشس کی ڈائری کی آخری قسط ارسال کر رہا ہوں۔ اس کے بعد انشاء اللہ دار السلام تنزانیہ کے بارے میں لکھوں گا۔

گاندھی انسٹی ٹیوٹ

۱۵ دسمبر ۱۹۹۳ء کو محمد حسین دھال صاحب مجھے اور جناب ملک محمد حسین صاحب کو گاندھی انسٹی ٹیوٹ دکھانے کے لیے لے گئے۔ یہ انسٹی ٹیوٹ شہر سے باہر نہایت پُرفضا جگہ پر واقع ہے۔ بڑا وسیع و عریض رقبہ اس کے تصرف میں ہے۔ اس انسٹی ٹیوٹ کی تعمیر میں حکومتِ ہند نے بڑا خرچ کیا ہے، بلکہ اب بھی اس کے مصارف کا اسی فیصد بھارتی حکومت برداشت کرتی ہے۔ اسے ماریشس میں ہندو کلچر کی اشاعت و ترویج اور علی الخصوص گاندھی کی تعلیمات فروغ دینے کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ اس کا معیار انٹرمیڈیٹ کا ہے۔ سیکنڈری کالج کی عمارت بڑی عالیشان ہے۔ آڈیٹوریم بھی فنِ تعمیر کا نہایت کامیاب نمونہ ہے۔ آڈیٹوریم کے سامنے پتھروں کے ڈھیر پر گاندھی جی کا مجسمہ رکھا ہوا ہے جسے حسبِ عادت ننگ دھڑنگ دکھایا گیا ہے۔ ہم لوگ سیدھے انسٹی ٹیوٹ کی لائبریری کی طرف چلے گئے۔ یہ بھی ایک بہت بڑی بلڈنگ میں واقع ہے۔ لائبریری کے ڈائرکٹر بارک صاحب نے ہمارا خیر مقدم کیا۔ ابتدائی بات چیت کے بعد ہم لائبریری کے اندر رکھا ہوا کتابوں کا ذخیرہ

دیکھنے کے لیے اُٹھے۔ اُردو اور عربی سیکشن کے انچارج ایک مسلمان نوجوان ہیں جن کا نام احمد قاسم ہیرا ہے۔ لائبریری میں انگریزی اور فرانسیسی کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ ہندوستان کی تاریخ و تہذیب پر ہر طرح کی کتاب موجود ہے۔ اور شاید اس موضوع سے متعلق کوئی اہم کتاب ایسی نہ ہوگی جو اس ذخیرے میں موجود نہ ہو، البتہ اُردو ذخیرہ بہت کم ہے۔ زیادہ تر اُردو کتابیں بھارت کی چھپی ہوئی ہیں۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ کی بعض تصانیف بھی موجود ہیں۔ احمد قاسم ہیرا صاحب نے مولانا کی تمام کتابیں فراہم کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ انہوں نے بتایا کہ بہت سے حضرات ان اردو کتابوں سے استفادہ کرتے ہیں۔ یہاں کے نوجوانوں کے اندر اسلامی لٹریچر کی مانگ موجود ہے۔

لائبریری کے اندر ہندو لڑکے اور لڑکیاں بیٹھے خاموشی کے ساتھ مطالعہ و تحقیق میں مصروف تھے۔ سٹاف میں بھی بہت سی ہندو لڑکیاں نظر آئیں۔ احمد قاسم ہیرا صاحب نے بتایا کہ اس انسٹی ٹیوٹ میں اُردو زبان کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ اُردو زبان کا کورس خود ہیرا صاحب اور ان کے ایک دوست نے مل کر تیار کیا ہے۔ اس کورس کا ایک مکمل سیٹ انہوں نے ہمیں فراہم کیا۔ اور چلتے ہوئے انہوں نے مزید تاکید کی کہ میں انہیں خاص طور پر تفہیم القرآن کے اُردو اور انگریزی سیٹ لائبریری کو بھیجوں۔

راقم نے گو انسٹی ٹیوٹ کا نہایت مختصر تعارف کرایا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ادارہ انڈین اوشن کے اندر بھارت کے سیاسی افکار کی ترویج کا اہم ادارہ ہے۔ اس سے نہ صرف ماریشس کے اندر ہندو تہذیب اور ہندو نظریات کی اشاعت کی جاتی ہے، بلکہ بحرِ ہند کے دیگر جزائر رینیون، مڈغاسکر، سیشلز اور کمورو تک اس کے اثرات پھیل رہے ہیں۔ تعلیم و تربیت اور تحقیق ان تینوں ذرائع کو انسٹی ٹیوٹ اپنے مقاصد کے لیے بڑے سلیقے اور منصوبہ بندی کے ساتھ بروئے کار لا رہا ہے۔ ۱۹۷۶ء میں مسز اندرا گاندھی نے اس کے ایک سیکشن کا افتتاح کیا تھا۔ ان کے نام کی تختی سے یہ بات معلوم ہوئی۔

ماہی پور کا وفد انسٹی ٹیوٹ سے فارغ ہو کر موباسا واپس آئے تو ماہی پور MAHE BOURG کے رفقاء کا ایک وفد مولانا جمیل احمد صاحب کی قیادت میں آیا ہوا تھا۔ یہ حضرات ہمیں ماہی پور

لے جانا چاہتے تھے۔ وہاں انہوں نے مقامی نوجوانوں کا ایک اجتماع بلا رکھا ہے۔ موباسا سے ماہی پور زیادہ دور نہیں ہے، مگر مولانا جمیل احمد صاحب نے ساحل سمندر کا طویل راستہ لے لیا، تاکہ ہم لوگ راستے کے شہر اور بستیاں دیکھ لیں۔ چنانچہ ہم ساحل ساحل ماہی پور روانہ ہوگئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جزیرہ ماریشس بڑا سرسبز و شاداب ہے۔ رنگ برنگ کے درختوں اور پھولوں نے پورے جزیرے کو ڈھانپ رکھا ہے۔

پامپلے موسس گارڈن راستے میں ہم لوگ کچھ دیر کے لیے ماریشس کے مشہور گارڈن پامپلے موسس (PAMPLE MOUSSES) میں ٹھیر گئے۔ یہ گارڈن دنیا کے مشہور ترین گارڈنز میں سے ہے۔ مولانا جمیل احمد صاحب جو ماریشس کی تاریخ اور ماریشس کے چپے چپے کے پوست کندہ حالات جانتے ہیں، بتانے لگے کہ یہ گارڈن فرانسیسی دور میں ایک فرانسیسی گورنر نے لگوایا تھا اور اسی کے نام سے موسوم ہے۔ اس کا رقبہ ایک سو ایکڑ ہے۔ فرنچ گورنر باغبانی کا ماہر تھا۔ اس نے نہ صرف یہ باغ لگوایا، بلکہ اس نے پہلی مرتبہ ماریشس کے اندر گنے کی کاشت کی۔ اور یہی گنا آج ماریشس کی سب سے بڑی دولت بنا ہوا ہے۔ باغ کے بیچ میں اس فرانسیسی گورنر کا محل بھی ابھی تک موجود ہے۔ گارڈن میں ہر نوع کا درخت موجود ہے۔ بیگان ویلی اور کنول کے پھول بڑی بہار دکھا رہے ہیں۔ آم، لیچی، ناریل، بانس اور پام روز کے درختوں نے بڑا دلکش منظر پیدا کر رکھا ہے۔

ماہی پور میں تحریکِ اسلامی ماہی پور کے حضرات دوپہر کا کھانا ماہی پور سے ہی ساتھ لے آئے تھے۔ چنانچہ ہم نے اس مشہور تاریخی باغ میں بیٹھ کر دوپہر کا کھانا کھایا۔ ماہی پور کے یہ حضرات اپنے علاقے میں تحریکِ اسلامی کے نہایت فعال کارکن ہیں۔ خود مولانا جمیل احمد صاحب بڑے صاحبِ علم و فضل آدمی ہیں۔ اصل میں ان کا تعلق صوبہ سرحد کے علاقے سوات سے ہے۔ ان کے والد مرحوم مولانا ایوب احمد ۱۹۰۵ء میں ماریشس میں آئے تھے اور پھر یہاں ہی بس گئے۔ ان کے ساتھ صوبہ سرحد کے دو اور علماء تھے مولانا لطف الرحمان اور مولانا محمد اسماعیل۔ مولانا جمیل احمد کی ابتدائی تعلیم و تربیت ماریشس میں ہوئی۔ ۱۹۵۰ء تک یہ انگریزی فوج کے ساتھ مصر میں رہے۔ پھر واپس ماریشس آگئے۔ جدہ یونیورسٹی

سے عربی زبان کا دو سالہ کورس بھی کر آئے ہیں۔ اُردو زبان نہایت فصاحت کے ساتھ بولتے ہیں۔ مولانا مودودی مرحوم کے ساتھ بھی ان کی مراسلت رہی ہے۔ موصوف اب ماہی پور اور اُس کے اِردگرد کے قصبوں اور قریوں میں تحریک اسلامی کی اشاعت میں مصروف ہیں۔ ماہی پور کے ایک سکنڈری کالج میں پڑھاتے ہیں اور ماہی پور کی جامع مسجد میں خطبۂ جمعہ بھی دیتے ہیں۔

پامپلے موس کے گارڈن میں جب ہم کھانا کھا رہے تھے تو مولانا جمیل احمد صاحب خود اپنی داستان بھی بیان کر رہے تھے اور خاکسار سے بھی مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات و سوانح دریافت کر رہے تھے. موصوف مولانا مرحوم کے عام معمولات سے لے کر ان کے سیاسی کردار تک کے بارے میں سوالات کرتے جا رہے تھے۔ اس طرح ہماری یہ محفل صرف کھانے تک محدود نہ تھی، بلکہ دعوت اور دعوتی تاریخ کا ہلکا پھلکا اجتماع بن گئی۔

دیہی آبادی پر ایک طائرانہ نظر

کھانے سے فارغ ہو کر ہم اپنی منزل کی طرف چل پڑے۔ راستے میں ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ پورا علاقہ آباد ہے۔ باغات ہیں اور گنّے کے کھیت۔ ایک طرف سمندر اور اُس کی اُٹھتی ہوئی موجیں جو کنارے سے ٹکرا کر واپس ہو جاتی ہیں اور دوسری طرف سبزہ و گُل۔ یہ دلکش و نظر افروز مناظر دُنیا میں کم ملتے ہیں راستے میں ایک قصبے میں سڑک کے کنارے ہی ایک مسجد مل گئی۔ وہاں ہم نے ظہر کی نماز ادا کی۔ یہ مسجد بھی پورٹ لوئس، بوباسا، روز ہل اور کیورپیپ کی مساجد کی طرح نہایت صاف اور آرام دہ ہے۔ مسجد کے ساتھ ہی ایک قبر ہے۔ ایک مقامی آدمی نے بتایا کہ یہ قبر اُس شخص کی ہے جس نے اِسی مسجد میں ۷۰ سال تک اذان دی ہے۔ اس کا نام قدرت الٰہی ہے۔

راستے میں جتنے قصبے اور بستیاں ملی ہیں، یہ آبادی کے لحاظ سے ملی جُلی ہیں۔ ان میں ہندو بھی آباد ہیں اور مسلمان اور عیسائی بھی۔ ہر بستی میں ایک مسجد، ایک مندر اور ایک چرچ ضرور ملے گا۔ مسجد کی شان ان تمام عبادت گاہوں سے نرالی ہے۔ مندر میں بھی کبھی کبھار پوجا پاٹ ہوگی، چرچ بھی ہفتے میں ایک دن اپنا گھڑیال بجالے گا، مگر مسجد سے پانچ وقت لاؤڈ اسپیکر سے اذان ہوگی اور بستی کے مسلمان اس کا رُخ کر رہے ہوں گے۔ پیچھے عرض کر چکا ہوں کہ ماریشس

میں کل ۱۲۰ قصبے اور بستیاں ہیں اور ۱۰۰ مساجد۔ خاکسار نے چھوٹے چھوٹے دیہاتوں کی مساجد کو بھی نہایت خوبصورت، صاف اور آرام دہ پایا ہے۔ آرام دہ کا لفظ میں مساجد کے لیے اس لیے استعمال کر رہا ہوں کہ ہر مسجد کے باہر دروازے پر سیمنٹ کے بنچ رکھے ہوتے ہیں، لوگ ان پر بیٹھ کر اپنے بوٹ کھولتے اور جرابیں اتارتے ہیں اور پھر بوٹ وہیں رکھ جاتے ہیں۔ وضو کے لیے بھی نشستوں کا انتظام ہوتا ہے۔ اسی طرح مسجد کے اندر نرم نرم قالین بچھے ہوتے ہیں۔ اگر کوئی آرام بھی کرنا چاہے تو بڑی خوبی سے اپنا وقت گزار سکتا ہے۔

فلاک کی مخلوط آبادی اور مسلمان ساحل کے ساتھ ساتھ ہم جا رہے ہیں۔ ہمارا رخ فلاک (FLACQ) کی طرف ہے۔ یہ ماریشس کے شمال مشرق میں ہے اور مرکزی مقام ہے۔ یہاں مسلمانوں کا اچھا جمگھٹا ہے۔ فلاک سے پہلے جتنی آبادی دیکھی ہے اس میں اکثریت مدراسیوں کی نظر آئی۔ یہ مدراسی تامل بولتے ہیں۔ ان کے مرد کوٹ اور پتلون پہنتے ہیں اور ان کی عورتیں اپنا روایتی لباس پہنتی ہیں، جس میں جسم کا اکثر و بیشتر حصہ ساتر رہتا ہے۔ افریقی اور چینی عورتیں دیہاتوں میں بھی اسکرٹ پہنتی ہیں۔ مسلمان مردوں کا لباس تو پتلون اور قمیص ہوگا، البتہ مسلمان عورتیں اکثر و بیشتر شلوار اور پاجامے میں ملیں گی۔ اونچی ذات کی ہندو لڑکیاں مغربی لباس اختیار کرچکی ہیں۔ دوسروں سے امتیاز کے لیے وہ پیشانی پر تلک لگا لیتی ہیں۔ گویا ماریشس کا معاشرہ ایک عجیب ملغوبہ ہے۔ مختلف مذاہب اور تہذیبیں جمع ہو چکی ہیں جو ایک دوسرے سے ممیز بھی رہنا چاہتی ہیں اور باہم مل کر بھی۔

ماریشس اور ہانگ کانگ ہمارے مولانا جمیل احمد صاحب اس معاشرے کی نفسیات اور تاریخ سے خوب واقف ہیں۔ راستے میں لکڑی کے کھوکھوں جیسے گھر دیکھ کر جب میں نے مولانا سے سوال کیا کہ کیا یہ غربت کی نشانی ہے تو مولانا نے بتایا کہ یہ مدراسی اور افریقی نسل کے لوگ ہیں۔ ماہی گیری ان کا پیشہ ہے اور روزانہ جو کمائی کرتے ہیں شام کو شراب پی کر اُڑا دیتے ہیں، اس لیے یہ ترقی نہیں کرسکتے۔ ماریشس کے سابق وزیراعظم رام غلام کا چالیس سالہ دور مولانا کی نظر سے گزرا ہے، اس لیے مولانا کسی حد تک رام غلام کے دور کو سراہتے ہیں۔ موصوف نے بتایا کہ ماریشس میں اس وقت ۲۵۰ فیکٹریاں اور کارخانے ہیں۔ ان

میں ۳۰ ہزار مزدور کام کرتے ہیں۔ کپڑے کی مل ایک پاکستانی کے ہاتھ میں ہے۔ مارشیس کی چینی اور کپڑا دنیا کے اندر مشہور ہے۔ مارشیس کا کل رقبہ ۵۰، مربع میل ہے۔ مارشیس کی کل گولائی ۱۲۰ میل ہے۔ صنعت میں ہندو اور چینی پیش پیش ہیں۔ تیسرے درجے پر مسلمان ہیں۔ مولانا نے بتایا کہ ہانگ کانگ کے تاجر مارشیس کو اپنا مستقبل کا مرکز بنا رہے ہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ۱۹۹۷ء میں انگریزی اقتدار ہانگ کانگ میں ختم ہو جائے گا اور کمیونسٹ چین ہانگ کانگ پر قابض ہو جائے گا۔ اس کے نتیجے میں ہانگ کانگ کی پوری صنعت و تجارت متاثر ہو گی۔ اسی لیے ہانگ کانگ کے صنعت کار اور تاجر ابھی سے انڈین اوشن کے جزائر کا رخ کر رہے ہیں اور سب سے بہتر جزیرہ ان کی نظر میں مارشیس ہے۔ چنانچہ وہ چاہتے ہیں کہ اپنی ساری انڈسٹری مارشیس میں چینی دور سے پہلے پہلے منتقل کر لیں۔ یہاں کی حکومت بھی ان کا خیر مقدم کرے گی۔ مولانا جمیل احمد صاحب مارشیس کے مستقبل کا جائزہ دراصل اس نقطۂ نظر سے لے رہے ہیں کہ آئندہ یہاں اسلام کا کیا کردار ہو گا۔ بہرحال موصوف آنے والے دور پر مطمئن تھے۔ ان کا خیال ہے یہاں اسلام کا مستقبل روشن ہے، البتہ اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ اس کے لیے پیشگی منصوبہ بندی کی جائے اور اس کے مطابق کام کیا جائے۔

تفرقہ بازی اور نئی نسل خاکسار نے سوال کیا کہ "گڑھی شاہو یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کرنے والے" بزرگ جو یہاں آتے ہیں، ان کے اثرات کا کیا حال ہے۔ مولانا جمیل احمد صاحب نے بتایا کہ ایک وقت ایسا تھا کہ ان صاحب نے وہابی اور لہابی (ابولہب کی نسبت) کی اصطلاحیں یہاں کثرت سے پھیلائیں اور ہر سنجیدہ اور صحیح الفکر مسلمان ان اصطلاحوں کی زد میں آیا، مگر اب نئی نسل باشعور ہے۔ اس نسل کے اندر ان کے اثرات بہت سکڑ گئے ہیں۔ جہاں پہلے ان کی خاطر ہزاروں لوگ جمع ہوتے تھے اب چالیس اور پچاس سے زائد جمع نہیں ہوتے۔

ماہی پور میں تحریک اسلامی کا کام عصر کی نماز ہم نے ماہی پور میں آکر ادا کی۔ ماہی پور مارشیس کے جنوب مشرق میں واقع ایک قصبہ ہے۔ اس کی آبادی ۲۰ ہزار ہے۔ اس میں مسلمان ۳ ہزار

کے لگ بھگ ہیں ۔ یہاں تحریک اسلامی کے پرانے رفیق جناب عبدالرشید صاحب ہیں ان کا تمام گھرانہ خدا کے فضل سے تحریک اسلامی سے وابستہ ہے ۔ پورٹ لوئس ، واکوا ، روزبل اور ربوباسا کے بعد اسلامک سرکل کا یہاں کافی اچھا کام ہے ۔ عبدالرشید صاحب کی ایک صاحبزادی ریاض (سعودی عرب) کے گرلز کالج سے تعلیم حاصل کر کے آئی ہیں ۔ وہ فرنچ، انگریزی اور اردو کے ساتھ ساتھ اب عربی زبان میں اور اسلامی علوم میں بڑی قدرت اور مہارت رکھتی ہیں ۔ لڑکیوں کے اندر تحریک اسلامی کا کام انہوں نے شروع کر رکھا ہے ۔ ماریشس سے پانچ لڑکیاں ریاض کے گرلز کالج میں داخل ہوئی ہیں ، ان میں سے چار فارغ ہو کر آگئی ہیں اور پانچویں لڑکی اس سال فارغ ہو کر آجائے گی ۔ فارغ ہو کر آنے والی لڑکیوں میں سے ایک عبدالرشید صاحب کی صاحبزادی ہیں ۔ عبدالرشید صاحب کی ایک صاحبزادی کی شادی جزیرہ ری یونین میں ہوئی ہے ۔ ان کے خاوند کا نام قاضی ابراہیم ہے ۔ قاضی صاحب بھی تحریک اسلامی کے بڑے ہمدرد ہیں اور جزیرہ ری یونین میں اپنی تجارتی سرگرمیوں کے ساتھ تحریک کا کام بھی کر رہے ہیں ۔ ماہی پور میں داخل ہونے کے بعد سب سے پہلے ہم عبدالرشید صاحب کے گھر گئے ۔ وہاں کچھ دیر کے لیے آرام کیا ۔ عبدالرشید صاحب کے گھر میں تحریک اسلامی کا ضروری لٹریچر موجود ہے ۔ عبدالرشید صاحب نے بتایا کہ ہم لوگ یہاں رہتے ہوئے جو کچھ اردو زبان جانتے ہیں وہ تفہیم القرآن کا فیضان ہے ۔ ہم سب اہل خانہ اس کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں ۔ مطالب قرآن کے ساتھ ہمیں تفہیم القرآن سے اردو زبان سیکھنے اور بولنے کی مشق بھی ہو جاتی ہے ۔

اسلامی دعوت پر تقریر

نماز عصر ماہی پور کی جامع مسجد میں ادا کی ۔ یہ مسجد دراصل اسلامک سرکل کی سرگرمیوں کا مرکز ہے ۔ مسجد نہایت وسیع اور کشادہ ہے ۔ مسجد کے ساتھ ایک لائبریری بھی ہے جس میں جماعت اسلامی کا پورا لٹریچر موجود ہے ۔ ہفتے میں چار دن مرد یہاں مطالعہ کرتے ہیں اور دو دن عورتیں اس لائبریری سے استفادہ کرتی ہیں ۔ ایک دینی درس گاہ بھی زیر تعمیر ہے جو چند ماہ تک مکمل ہو جائے گی ۔ اس درس گاہ میں دینی علوم اور عربی زبان کی تعلیم دی جائے گی ۔

نمازِ عصر کے بعد مسجد کے اندر اجتماع شروع ہوا۔ خاکسار نے اسلامی دعوت کے موضوع پر تقریر کی۔ آخر میں پاکستان میں تحریکِ اسلامی کی سرگرمیوں اور افغانستان میں جہاد کی صورتِ حال پر بھی روشنی ڈالی۔ ماہی بورگ کی مسجد میں خواتین کے لیے بھی باپردہ نماز اور دیگر اجتماعات میں شرکت کا انتظام ہے۔ آج کے اجتماع میں خواتین بھی شریک ہیں۔ میرے بعد ملک محمد حسین صاحب نے تقریر کی۔ عام حاضرین نے اُردو میں ہماری تقاریر سمجھ لیں، لیکن ایک قلیل تعداد ایسی تھی جو اُردو نہیں سمجھتی تھی، ان کے لیے مولانا جمیل احمد صاحب نے کریولی زبان میں تقاریر کا خلاصہ پیش کر دیا۔

سوالات تقاریر کے بعد سوالات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ سوالات زیادہ تر مقامی معاشرتی حالات سے تعلق رکھتے تھے، مثلاً یہ سوال کہ مسلمان کا جنازہ ہندو اُٹھا سکتا ہے یا نہیں، ہندو قرآن کو ہاتھ لگا سکتا ہے یا نہیں، مخلوط معاشرے میں دعوتِ اسلامی کا کام کیسے کیا جائے۔ مغرب کی نماز تک سوالات و جوابات کا سلسلہ شروع رہا۔ حاضرین نے اس سلسلے میں بڑی دلچسپی لی۔ اندازہ ہوا کہ یہاں کا نوجوان تحریکِ اسلامی سے کافی متاثر ہے۔ بعض نوجوانوں نے اپنی اس شدید خواہش کا اظہار کیا کہ وہ پاکستان آکر تحریکِ اسلامی کی تربیت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

پورٹ لوئس کی مساجد میں تقریریں ماہی بورگ کا سفر نہایت معلومات افزا رہا اور یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس دُور دراز جگہ پر بھی اللہ کے بندے اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور نوجوان نسل کی صحیح اسلامی تربیت میں لگے ہوئے ہیں۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد ہم واپس موباساچل دیئے۔ اب ہمارے رفقا نے طویل راستہ اختیار کرنے کے بجائے مختصر راستہ اختیار کیا۔ دو گھنٹے کے بعد ہم کیورپیپ (CUREPIPE) پہنچ گئے۔ یہ شہر ماریشس کا دوسرا صدر مقام کہلاتا ہے۔ راستے میں ایک مسجد میں نماز عشا ادا کی۔ یہ ماریشس کی بڑی نمایاں خوبی ہے کہ سڑکوں پر سفر کرتے وقت راستے میں جگہ جگہ مسجدیں مل جاتی ہیں۔

۱۶ دسمبر ۱۹۸۳ء جمعۃ المبارک کا دن ہے۔ اسلامک سرکل کے منتظمین نے ہم دونوں کی دو مختلف مسجدوں میں تقریروں کا انتظام کر رکھا ہے۔ ملک محمد حسین پورٹ لوئس میں مرکزی مسجد

میں خطبۂ جمعہ دیں گے اور خاکسار پورٹ لوئس کی مسجد نور الاسلام میں۔ مرکزی مسجد میں تبلیغی جماعت زیادہ تر سرگرم کار رہتی ہے، البتہ مسجد نور الاسلام اسلامک سرکل کے زیر اثر ہے۔ یہاں امامت وخطابت کے فرائض مولانا مصطفیٰ بہاری صاحب دیتے ہیں۔ موصوف ۵۵ یا ۶۰ سال کے ہوں گے، لیکن بڑے خدا ترس اور بے نفس انسان ہیں۔ امامت وخطابت اور تعلیم و تدریس کا تمام کام رضاکارانہ کرتے ہیں۔ ان کاموں کو انہوں نے قطعاً کسبِ دُنیا کا ذریعہ نہیں بنایا۔ مسجد نور الاسلام بڑی پُر رونق مسجد ہے۔ بڑی کشادہ۔ ساتھ ایک اچھی لائبریری بھی ہے، جس میں عربی، اُردو اور انگریزی و فرانسیسی زبانوں میں اسلامی کتابوں کا مناسب ذخیرہ ہے۔ نوجوان ان کتابوں سے استفادہ کرتے رہتے ہیں۔ مولانا مصطفیٰ بہاری ایک اسلامی تنظیم کے بھی نگران ہیں جس کا نام اسلامک مشن ہے۔ یہ تنظیم بھی ماریشس میں تحریکِ اسلامی کا ایک حصہ ہے۔ مولانا مصطفیٰ بہاری صاحب بڑے فعّال اور با اثر انسان ہیں۔ اسلامک مشن کے ذریعے نوجوانوں کے اندر کام کر رہے ہیں۔ فرانسیسی اور انگریزی زبان میں (LE CROISSANT) (النشاۃ ثانیہ) کے نام سے ایک ہفت روزہ اخبار بھی نکالتے ہیں۔

مسجد نور الاسلام میں تقریر خاکسار نے مسجد نور الاسلام میں نماز جمعہ کے موقع پر خطاب کیا۔ اس خطاب میں اسلام کے تقاضے اور مسلمان کے فرائض کے موضوع پر تقریر کی۔ ماریشس میں اپنے چند روزہ مشاہدات کی روشنی میں مسلمانانِ ماریشس کو چند مشورے پیش کیے جن میں بچوں اور خواتین کی اسلامی تعلیم، باہمی اتحاد اور غیر مسلم آبادی کے اندر قول وعمل کے ذریعے اسلام کی تبلیغ شامل تھی۔ مسجد نمازیوں سے بھری ہوئی تھی۔ نمازیوں کی اتنی بڑی تعداد پاکستان کی مساجد میں بھی کم نظر آتی ہے۔ اور سب سے اچھی بات یہ ہے کہ حاضرین اذانِ جمعہ کے بعد فوراً پہنچ جاتے ہیں اور جب خطیب اپنی تقریر شروع کرتا ہے تو اُس وقت مسجد بھر چکی ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں کے لوگ مسجدوں کے اندر اہلِ علم و دعوت کی باتیں سُننے کا شوق رکھتے ہیں جب کہ پاکستان میں یہ افسوسناک بات دیکھنے میں آتی ہے کہ عام نمازی محض اُس وقت مسجد میں داخل ہوتے ہیں جب خطیب اپنی تقریر سے فارغ ہو کر عربی خطبہ دینے

لگتا ہے یا نماز قائم کرنے کے قریب ہوتا ہے۔

بحر ہند کے جزائر | ۷ اردسمبر کو خاکسار تنزانیہ کے دارالحکومت دارالسلام روانہ ہوگیا۔ آئندہ خط میں انشاءاللہ دارالسلام کے حالات پر مشتمل اپنے خیالات پیش کروں گا۔ ماریشس کے حالات ختم کرتے ہوئے آخر میں انڈین اوشن کے جزائر کا مختلف تعارف کرائے دیتا ہوں:

ماریشس

رقبہ: ۷۵۰ مربع میل

آبادی: ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق نو لاکھ ستر ہزار۔

صدر مقام: پورٹ لوئس (آبادی ایک لاکھ ۴۵ ہزار)۔

زبان: سرکاری زبان انگریزی۔ مروجہ زبانیں: کریولی، ہندی، اردو، چینی، ٹامل، تلگو اور مرہٹی۔

تعلیمی تناسب: ۶۰ فیصد (۱۹۸۱ء کی شماریات کے مطابق)

اسلامی تحریک: اسلامک سرکل، سٹوڈنٹ اسلامک موومنٹ، اسلامک مشن۔

ووٹر کی عمر: ۱۸ سال۔

مڈغاسکر

عنوان: ڈیموکریٹک ریپبلک آف مڈغاسکر۔

رقبہ: ۵۸۷۰۴۱ مربع کلومیٹر۔

آبادی: ۸½ ملین (۱۹۸۰ء کی مردم شماری کی رو سے)۔

صدر مقام: انتاناناریو (ANTANANARIVO)

زبان: سرکاری زبان فرنچ اور مالاگاسی۔

صنعت: آئیل ریفائنری، شوگر، گوشت، مچھلی، پھل اور پھلوں کا جوس۔

خواندگی: ۵۰ فی صد (۱۹۷۹ء کی شماریات کے مطابق)۔

ووٹر کی عمر: ۱۸ سال

تاریخ: مڈغاسکر کی تاریخ اور ثقافت ۲ ہزار سال سے ہے جب یہاں ملایا کے باشندے آکر آباد ہوئے۔ دوسری نسلیں بہت بعد میں آئیں۔ ۱۹ ویں صدی کے آغاز تک یہاں کا رسم الخط عربی تھا۔ ۱۸۹۶ء میں فرانسیسیوں نے اس پر قبضہ کیا۔ ۱۹۶۰ء کو مڈغاسکر آزاد ہو گیا۔

اسلامی تحریک: یہاں اسلامی تحریک کے محدود اثرات ہیں۔ سنٹرل اسلامک سٹڈیز آف مڈغاسکر یہاں کی اسلامی تنظیم ہے۔ مولانا بسم اللہ صاحب یہاں کی اسلامی تحریک کی ایک نمایاں شخصیت ہیں۔

ری یونون:

اس جزیرے میں دس ہزار کے قریب مسلمان آبادی ہے۔ ماریشس کی سٹوڈنٹ اسلامک موومنٹ نے یہاں اپنی برانچ قائم کر رکھی ہے۔ ایم ایس آئندہ اپریل ۱۹۸۴ء میں یہاں اپنا تربیتی کیمپ لگائے گی۔

سیشلز

حکومت: ری پبلک آف سیشلز۔

رقبہ: ۴۰۴ مربع کلومیٹر

آبادی: ۵ لاکھ (ان میں ۲۸ ہزار بیرونی ممالک کے ہیں مسلمانوں کی تعداد یہاں بہت کم ہے)۔

خواندگی: ۸۵ فی صد۔

تاریخ: اٹھارھویں صدی کے آخر میں یہاں فرانسیسی آئے۔ ۱۸۱۴ء میں اس پر برطانیہ نے قبضہ کر لیا۔ ۱۹۰۴ء سے پہلے تک یہ ماریشس کی کالونی تھا۔ ۱۹۰۴ء میں آزاد کالونی کی حیثیت اختیار کر گیا۔ ۱۹۷۶ء میں آزاد ہو گیا۔

کمورو:

عنوان: اسلامک ری پبلک آف کمورو۔

صدر: احمد عبداللہ۔

صدر مقام: مورونی

آبادی: ۳ لاکھ ۷۰ ہزار

زبان: فرانسیسی اور عربی

صنعت: عطریات اور معمولی زراعت

تاریخ: کمورو پہلے مڈغاسکر کے تحت تھا۔ ۱۹۴۷ء میں الگ ریاست بن گیا۔ ۶ جولائی ۱۹۷۵ء کو آزاد ہوا۔ کمورو کی غالب اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ عام لوگ عربی زبان بولتے ہیں۔ یہاں اسلامی تحریک کے قیام کی بڑی ضرورت ہے۔

---

(۴)

اسمرا سے خط یہ خط میں آپ کو اسمرا سے لکھ رہا ہوں۔ یہاں آنے کا کوئی پروگرام نہ تھا، مگر حسن اتفاق سے بعض ناگزیر حالات کی وجہ سے یہاں آنا پڑا۔ دراصل میں دارالسلام (تنزانیہ) سے ادیس ابابا جا رہا تھا اور ایک دن اور ایک رات قیام کرنے کے بعد مجھے وہاں سے براستہ قاہرہ کویت جانا تھا۔ جب دارالسلام سے جہاز روانہ ہونے لگا تو اعلان کیا گیا کہ حبشہ کا ایرپورٹ ادیس ابابا زیر مرمت ہے، اس لیے جہاز اسمرا میں اترے گا اور وہاں سے قاہرہ جائے گا۔ یوں مجھے اسمرا میں ڈیڑھ دن اور ایک رات بسر کرنے کا موقع مل گیا۔ پہلی مرتبہ میں اسمرا آیا ہوں، ادیس بابا تو میں ۱۹۷۶ء میں خوب دیکھ چکا ہوں۔ عام حالات میں باہر کے لوگوں کو اسمرا آنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ بس اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی ایسا انتظام ہو گیا کہ جس جگہ آنے کی مدت سے خواہش تھی وہ غیر متوقع طور پر یکایک پوری ہو گئی۔

اسمرا اریٹیریا کا صدر مقام ہے۔ اس وقت حبشہ کی اشتراکی اور عیسائی حکومت نے اس پر قبضہ کر رکھا ہے۔ تاریخ میں یہاں ہمیشہ آزاد مسلم حکومت قائم رہی ہے مگر نصف صدی سے یہ علاقہ پہلے اٹلی کے زیر تسلط رہا اور پھر یو این او کی زیر نگرانی رہنے کے بعد آخر کار ایک

سازش کے تحت ہیلا سلاسی کے سپرد کر دیا گیا۔ اور اب ہیلا سلاسی تو نہیں رہا، اس کی جگہ حبشہ کی فوج قابض ہے، مگر یہ فوج بھی ایک طرف صلیبی رُوح سے لبریز ہے اور دوسری طرف اشتراکیت کا دم بھی بھرتی ہے۔ مسلمان مجاہدین پہلے بھی آزادی کی جدوجہد میں بہت قربانیاں دے چکے ہیں اور اب بھی بار بار اُٹھ کر نئی استعماری دیوار سے سر پھوڑنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

اسمرا کوئی بڑا شہر نہیں ہے۔ اس کی سڑکیں بڑی کشادہ ہیں۔ قدیم عمارات بھی کافی ہیں اور جدید عمارات بھی۔ قدیم عمارات میں مسلمان سلاطین کے مکانات، مساجد اور چھوٹے چھوٹے قلعے بھی ہیں۔ اسی طرح یہاں ایک قدیم گرجا بھی موجود ہے، جسے نجاشی کے دَور سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس گرجا کی عمارت بڑی پُرشکوہ ہے۔ اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ قدیم گرجا کی جگہ پر ایک نیا گرجا تعمیر کیا گیا ہے، کیونکہ موجودہ عمارت کا فنِ تعمیر اطالوی دَور سے مِلتا جلتا ہے۔ خاکسار اسمرا کی سب سے بڑی مسجد گیا۔ مگر اب چند سال خوردہ بوڑھوں کے سوا ادھر کوئی رُخ نہیں کرتا۔ اس کی وجہ لوگوں کی مسجدوں سے بے تعلقی نہیں ہے، بلکہ مسلمانوں پر عیسائی اشتراکی حکومت کا شدید دباؤ ہے۔ اسمرا سے کچھ فاصلے پر زیلع کا مقام بڑی تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ نصب الرایۃ فی تخریج احادیث الھدایۃ کے مصنف امام زیلعی اسی شہر کے رہنے والے تھے۔ اس علاقے کی علمِ دین میں خدمات سمرقند اور بخارا سے کم نہیں ہیں۔

اسمرا کا موسم آج کل بہت اچھا ہے۔ دن کو معمولی خنکی اور رات کو قدرے سردی محسوس ہوتی ہے۔ خاکسار نے اسمرا کے تمام نمایاں بازاروں کا گشت کیا۔ بہت کم لوگ بازاروں میں دکھائی دیئے۔ بڑے بڑے کشادہ بازار اور کشادہ دکانیں، مگر گاہکوں کی قلت اور سُونی سُونی دنیا۔ خاکسار نے پہلے یہ خیال کیا کہ شہر کی آبادی کم ہے، باہر کے لوگوں کا بھی یہاں بہت کم گزر ہوتا ہے، اس لیے یہ ایک مقامی سرگرمیوں پر مشتمل محدود سی دُنیا ہے۔ میرا یہ خیال بعد میں غلط ثابت ہوا۔

ہنگامی حالات کے اثرات

یہ شہر دراصل ایک ہنگامی حالت میں جی رہا ہے۔ سڑکوں کے

اردگرد اور علی الخصوص چوکوں کے اندر فوج مورچے کھود کر بیٹھی ہوئی ہے۔ کوئی ایسی سرکاری عمارت نہیں ہے، جہاں فوج ہتھیار لے کر نہ بیٹھی ہو، بلکہ بعض اہم عمارات اور اہم چوراہوں پر تو چھوٹی توپیں بھی نصب ہیں۔ ہر وقت فوجی پیدل اور جیپوں میں اِدھر سے اُدھر گشت کرتے رہتے ہیں۔ تمام سرکاری دفاتر، ہوٹلوں اور بنکوں میں داخل ہوتے ہر وقت آدمی کی تلاشی لی جاتی ہے۔

ہم جس ہوٹل میں ٹھیرے ہوئے ہیں، اُس کا نام ایمبیسڈر ہے۔ اچھا ہوٹل ہے، مگر ہوٹل کے دروازے پر چند حبشی فوجی بیٹھے ہیں جو ہر اُس شخص کی جو ہوٹل کے اندر داخل ہونا چاہتا ہو، ہاتھ اٹھا کر تلاشی لیتے ہیں۔ سوائے اُن لوگوں کے جن کے پاس حکومت کے جاری کردہ پاس ہوں، تلاشی سے کوئی مستثنیٰ نہیں ہے۔ خاکسار اپنے پاکستانی لباس میں بازاروں کے اندر جب گھومتا پھرتا تھا تو چلتے پھرتے فوجی گھور گھور کر دیکھتے تھے، لیکن اجنبی سمجھ کر نظر انداز کر دیتے تھے۔

مسلمان گھروں میں فوجی مداخلت میں ایک چھوٹے سے محلے سے گزر رہا تھا۔ یکایک چند فوجی آئے اور انہوں نے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے ایک معمر انسان نکلا اور اُس نے دروازہ کھولا۔ چنانچہ یہ فوجی کوئی بات کہے بغیر اندر گھس گئے۔ اس واقعہ کا ذکر میں نے احمد ابراہیم نامی ایڈیٹر سے کیا، جس کا مجھ سے راستے میں چلتے ہوئے تعارف ہوا، وہ کہنے لگا یہ محلہ مسلمانوں کا ہے اور فوج کی یہ چیرہ دستی مسلسل جاری ہے۔ جب کسی گھر میں کوئی فوجی گھسنا چاہے گھس جاتا ہے اور شک و شبہ کی بنیاد پر لوگوں کی تلاشی لینے کے بہانے جو کرنا چاہے کر لیتا ہے۔

مسلمانوں کا تشخص قائم ہے دن کو بھی لوگ خوفزدہ اور سہمے سہمے نظر آئے اور رات ہوئی تو اعلان کر دیا گیا کہ رات کے دس بجے کے بعد کوئی شخص باہر نہ نکلے، کیونکہ شہر میں کرفیو نافذ ہے۔ دن کے وقت سڑکوں پر اسکولوں اور کالجوں کے لڑکے اور لڑکیاں ہاتھ میں کتابیں لیے نظر آئے، اسمرا میں تعلیم مخلوط ہے اور اب حکمرانوں کی طرف سے لڑکے اور لڑکیوں کے باہم اختلاط کے مسلسل پروگرام رکھے جاتے ہیں۔ تبدیلیٔ حالات کے باوجود میں نے اسمرا کی

مسلمان دوشیزاؤں کو بڑے وقار اور ساتر لباس میں دیکھا ہے۔ مسلمان لڑکیاں اپنی روایاتی
چادر اوڑھتی اور سر کو ڈھانپ کر رکھتی ہیں، عیسائی لڑکیاں اسکرٹ پہنتی ہیں مسلمان
مردوں اور عورتوں کو دیکھتے ہی پتہ چل جاتا ہے کہ یہ مسلمان ہیں۔ ان کے چہروں پر
کبیدگی، خوف اور حالات سے بیزاری کی علامات صاف نمایاں نظر آتی ہیں، ان کے
مقابلے میں عیسائی آبادی (جو اگرچہ بہت کم ہے) اپنی نسبتاً مالی خوشحالی کی غمازی کرتی ہے۔

امہری، عربی اور ہیلتھ سرٹیفکیٹ

یہاں کی عام زبان تو امہری ہے، مگر عربی کا بھی بڑا
رواج ہے۔ مجھے راہ چلتے کئی لوگوں نے سلام کیا اور پھر عربی میں خیریت دریافت کی۔
یہاں کی عربی صومالی اور سوڈانی لہجوں سے ملتی جلتی ہے۔ ایک ہفت روزہ اخبار العلم بھی
عربی میں نکلتا ہے۔ اس کا ایڈیٹر کوئی عیسائی ہے، اس لیے اس میں مضامین اور خبریں
بھی یا تو عیسائیوں سے متعلق ہیں اور یا حکومت کی اشتراکیت نواز پالیسی کی ترجمان۔ بہرحال
مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ ہوٹل میں میرے افریقی ساتھی تو مقامی زبان نہ جاننے کی وجہ سے
کچھ تنگی محسوس کرتے رہے اور خاکسار سوڈانی لہجے کی عربی بول کر ہر جگہ اپنا کام نکالتا
رہا۔ ہوٹل، بازار، ایئرپورٹ جہاں بھی مجھے کسی سے واسطہ پڑا، میں عربی بول کر کام چلاتا
رہا۔ بلکہ جب کوئی مسلمان ایریٹیرین میرا اسلامی نام سنتا تو بڑی محبت اور توجہ سے لپک
کر میرا کام کرتا۔ اسمرا ایئرپورٹ پر اترتے ہی مجھے ایک مسئلہ پیش آگیا۔ میرے پاس ہیلتھ
سرٹیفکیٹ نہیں تھا اور یہاں ییلو فیور (زرد بخار جو مشرقی اور جنوبی افریقہ کے اندر پھیلا
ہوا ہے اور جو ادھر آئے اسے اس کا انجکشن لگوانا ضروری ہوتا ہے) کے انجکشن کا سرٹیفکیٹ
دکھانا ضروری تھا۔ میرے جن ساتھیوں کے پاس یہ سرٹیفکیٹ نہ تھا، انہیں ایک طرف کر دیا گیا اور
مجھے متعلقہ افسر نے اہلاً و سہلاً کہا اور آگے نکال دیا۔ اللہ تعالیٰ اسے اجر نیک عطا فرمائے۔
مسلمان اریٹیرین کا پاکستانی مسلمان بھائی کے ساتھ یہ حسنِ سلوک اور حسنِ تعاون مجھے ہر جگہ
محسوس ہوا۔

عیسائی اور مسلمان

یہ کرسمس کے دن ہیں اور حکومت اور عیسائی عوام اس میں خاصے مگن ہیں۔
قدیم گرجاہوں یا جدید گرجا (جن کی اب اسمرا میں بھرمار کر دی گئی ہے) ان کے باہر مفلوک الحال

بچے اور بچیوں کے جھمگٹے ہیں۔ ان گرجاؤں میں روٹی کے چند ٹکڑے تقسیم ہوتے ہیں، ان کو حاصل کرنے کی خاطر یہ بچے ٹوٹے پڑ رہے ہیں۔ یہاں غربت بڑی نظر آئی، علی الخصوص مسلمان آبادی جو اپنے چہروں سے پہچانی جاتی ہے غربت کا بُری طرح شکار نظر آتی ہے۔ اس سب کے باوجود مَیں نے کسی مسلمان کو گداگری کرتے نہیں دیکھا۔

اسمرا میں اسلامی رجحانات

اسمرا کی اکثریت مسلمان ہے، لیکن اسمرا کی بڑی بڑی عمارات حکومت کے قبضے میں ہیں یا بہ حبشی سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہیں۔ مسلمان محلوں کی حالت بہت خستہ ہے۔ اور جب تک اری ٹیریا آزاد نہیں ہوجاتا یہ خستگی دُور نہیں ہوسکتی۔ مسجد کے ایک شیخ سے جس کا نام واضح کرنا مناسب نہیں ہے، خاکسار کو یہ معلوم ہوا کہ اسمرا کے مسلمان موجودہ حالات سے سخت بیزار ہیں۔ اور باوجودیکہ انھیں حریت پسندوں سے تعاون کے الزام میں دبایا جاتا ہے، مگر وہ آزادی کی خواہش سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ انھوں نے امہری زبان میں آج کا اخبار مجھے دکھایا۔ اُس میں ایک تصویر کی طرف اشارہ کیا کہ یہ ایک امام مسجد کی تصویر ہے۔ اسے ایک سرکاری اجتماع میں جسے عید میلاد النبیؐ کا نام دیا گیا ہے، بزور تقریر کے لیے بلایا گیا ہے۔ تصویر میں جتنے حاضرین نظر آرہے ہیں، یہ سب سرکاری ملازم ہیں۔

عیسائیت اور کمیونزم

اسمرا ایجوکیشن انسٹی ٹیوٹ بین روڈ پر واقع ہے۔ ساتھ ہی ایتھوپین چرچ ہے۔ ملحقہ دوکانوں میں بعض کتابوں کی دکانیں ہیں۔ خاکسار ذوقِ کتب بینی کے تحت ان مکتبوں کی طرف نکل گیا۔ ایک نظر ڈالنے پر معلوم ہوا کہ زیادہ تر کتب امہری زبان میں ہیں جس کے حروف کی شکل سنسکرت کے حروف سے ملتی ہے۔ یہ رسم الخط دَورِ استعمار کی ایجاد ہے۔ اصل رسم الخط عربی تھا۔ کتابوں میں مختصر سا ذخیرہ انگریزی میں بھی تھا۔ امہری کتابوں کے ٹائیٹل پر بنی ہوئی تصاویر سے معلوم ہوتا تھا کہ زیادہ تر کتابیں دو مضامین پر مشتمل ہیں: ایک عیسائیت کا پرچار اور صلیب کی نقش بندی اور دوسرے کمیونزم کا لٹریچر، جس کا اندازہ کمیونسٹ لیڈروں کی تصاویر اور ہتھوڑی اور درانتی کی تصویروں سے ہوا۔ کمیونزم کی اشاعت خوب زور و شور سے ہو رہی ہے۔ ہم جس ہوٹل میں ٹھیرے ہوئے ہیں اُس میں بھی شمالی کوریا کے لوگ کثرت سے ٹھیرے ہوئے ہیں، بلکہ ایتھوپیا ایرلائن نے ہمارے لیے پہلے جو ہوٹل تجویز

کیا تھا اُس میں ہمیں جگہ نہ مل سکی، کیونکہ وہ کورین سے بھرا ہوا تھا۔ اسمرا سے متصل ہی اریٹیریا کی بحری بندرگاہ مصوّع ہے، وہاں بھی سُنا ہے اشتراکی ممالک سے آنے والے ماہرین کی خاصی بھیڑ ہے۔

حریت پسند مذکورہ بالا شیخ سے یہ معلوم ہوا کہ شہر کے اردگرد پہاڑوں میں اور علی الخصوص علاوہ کے مقام پر حریت پسند جمع ہوتے رہتے ہیں اور سرکاری فوجوں کے کیمپوں پر حملے کرتے رہتے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ ان کی طاقت کا کیا حال ہے، اُس نے بتایا مسلمان کے پاس سب سے بڑی طاقت اللہ پر ایمان اور بھروسہ ہے، لیکن مشکل یہ ہے کہ حریت پسندوں کے اندر اتحاد نہیں ہے۔ اور مزید برآں یہ کہ حریت پسندوں کے اندر ترقی پسندوں اور بائیں بازو والوں کا جو عنصر تھا، وہ اب اپنا کھیل ختم کر چکا ہے اور وہی عنصر آج تک حریت پسندوں کی قیادت پر چھایا ہوا تھا۔ اب نئی قیادت جنم لے رہی ہے جو اگرچہ بائیں بازو سے تعلق نہیں رکھتی، لیکن اُسے مجاہدین کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے ابھی وقت درکار ہے۔ شیخ نے یہ بھی حیرت انگیز انکشاف کیا کہ حریت پسندوں میں بعض عیسائی بھی ہیں، جو موجودہ اشتراکی حکومت کے خلاف ہیں۔

کثرتِ بادہ و جام اسمرا شہر کا ایک اور پہلو دیکھ کر بہت دکھ ہوا۔ یہ شہر دراصل "اسلامی شہر" ہے، لیکن یہاں پر ہر چند قدم کے بعد آپ کو ایک شراب خانہ ملے گا۔ شراب خانے کے دروازے پر ایک لڑکی کھڑی ہوگی جو شراب نوشی کی دعوت دے رہی ہوگی۔ البتہ مختصر قیام کے دوران میرا مشاہدہ یہ ہے کہ بازاروں میں چلتے پھرتے جب کسی شراب خانے کے پاس سے میرا گذر ہوا اُسے اُجڑا ہوا پایا۔ ایک ۲۵ سالہ طالب علم کے بقول جو ہاتھ میں کتابیں لیے جا رہا تھا اور مجھے دیکھتے ہی کہنے لگا: "انت مسلم۔ انت باکستانی"۔ میں نے ہاں میں جواب دیا اور پھر میں نے اُسے چھوٹتے ہی یہ پوچھا کہ یہاں "بارات" (بار کی جمع) بہت ہیں۔ کیا نوجوان کثرت سے بار کا رُخ کرتے ہیں؟ وہ کہنے لگا: "شراب حرام ہے۔ مسلمان ہرگز شراب نہیں پیتے۔ شراب پینے والے عیسائی ہیں یا خدا سے خوف نہ کھانے والا مسلمان"۔ میں نے دوبارہ کہا کہ آپ کے شہر کی مسجدوں کے اندر بھی نوجوان نمازی نہیں ملے۔

اُس نے جواب دیا : "جو نوجوان مسجدوں کا رُخ کرتے ہیں انہیں گرفتار کر لیا جاتا ہے۔" جب وہ یہ بات کہہ رہا تھا تو فوراً اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ شاید اُسے یہ خطرہ محسوس ہوا کہ کوئی نا ہنجار اُس کی بات نہ سن پایا ہو۔

۲۲ دسمبر ۱۹۸۳ء کو میں اسمرا کو الوداع کہہ رہا تھا۔ اس شہر کی اُداس سڑکیں، یہاں کے مسلمانوں کے اُجڑے ہوئے چہرے، مگر یہاں کے پام کے درخت اور بیگان ویلی کی ہر طرف چھائی ہوئی پھولدار بیلیں دل پر شدید اثر کر رہی تھیں۔ اس شہر کی خاموشی موت کا سناٹا نہیں ہے، بلکہ کسی بڑے طوفان کی آمد کی علامت ہے۔ یہ شہر تاریخ کے ہر دور میں مجاہدین کی کچھار رہا ہے اور اب بھی اس میں فوج کے گشت، جگہ جگہ خندقیں اور مورچے، ہر موڑ پر نصب توپیں اور ہر درخت کے نیچے کھڑی ہوئی فوجی جیپ اس بات کی غمازی کر رہی ہے کہ یہ شہر اپنے ذوقِ جہاد سے محروم نہیں ہوا۔ متنبی کا یہ شعر زبان پر تھا اور گاڑی اسمرا ایرپورٹ کی طرف جا رہی تھی۔

لک یا منازل فی القلوب منازلُ
اقفرتِ انت وھن منک اَوَاھِلُ

(باقی)

نوٹ : اگرچہ اس سلسلے کے کچھ ابتدائی خطوط دوسری جگہ چھپ چکے ہیں، مگر ایسے خطوط بھی آگے آئیں گے جو کہیں شائع نہیں ہوئے۔

(ادارہ)

احتیاط

ترجمان القرآن میں ضرورتِ استدلال کے لیے آیات و احادیث شائع ہوتی رہتی ہیں۔ قارئین سے گذارش ہے کہ جن اوراق پر آیات و احادیث ہوں۔ ان کا خاص احترام ملحوظ رکھیں تاکہ بے ادبی نہ ہونے پائے۔

(ادارہ)

صدارتی نظام کی شرعی حیثیت

جناب محمد امین صاحب - ریاض، سعودی عرب

پاکستان میں حال ہی میں جو دستوری کوششیں ہوئی ہیں، ان میں انصاری کمیشن اور اسلامی نظریاتی کونسل دونوں نے ملک میں ایسے سیاسی نظام کی حمایت کی ہے جس میں زیادہ تر اختیارات سربراہ مملکت کے پاس ہوں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے علماء اور سکالرز کا عمومی رجحان یہ ہے کہ صدارتی طرز حکومت اسلامی مزاج کے زیادہ قریب ہے اور اس کی دلیل عام طور پر یہ دی جاتی ہے کہ یہ خلافتِ راشدہ کے نظام کے مماثل ہے، جس میں زیادہ تر اختیارات خلیفہ کی ذات میں مرتکز تھے۔ ہمیں چونکہ اس نقطۂ نظر سے اختلاف ہے اس لیے ہم اس رائے اور اس کے دلائل کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے اس کے برعکس نقطۂ نظر کی حمایت میں شرعی دلیل لانے کی کوشش کریں گے کہ موجودہ حالات میں ایک ایسا نظامِ حکومت ہمارے لیے زیادہ موزوں اور مناسب ہے جس میں اختیارات ایک شخص کے بجائے متعدد اشخاص یا اداروں میں منقسم ہوں۔

سب سے پہلی بات تو یہ کہ طرز حکومت یا تقسیم اختیارات کا مسئلہ کوئی منصوص مسئلہ نہیں ہے۔ شریعت اسلامی کا عمومی منہج یہی ہے کہ جن امور کا ادراک عقل سے نہیں ہو سکتا یا جن میں کسی رد و بدل کا امکان نہیں ہے اور زیادہ زندگی کے بنیادی امور سے متعلق ہیں (عقائد، عبادات، حدود وغیرہ) تو ان میں شارع نے ہمیں واضح اور تفصیلی ہدایات دی ہیں تاکہ کسی شک و شبہ کا امکان باقی نہ رہے اور شریعت کی عمارت مضبوط بنیادوں پر کھڑی ہو جائے،

اس کے بعد جہاں ایسے معاملات سامنے آتے ہیں جن میں تفصیلی اور فروعی احکام درکار ہوتے ہیں اور خصوصاً ایسے امور ہیں جو تمدن انسانی کے ترقی کرنے کے ساتھ ساتھ بدل سکتے ہیں یا مختلف سوسائٹیوں میں انسانی عادات اور رسوم و رواج کی بنا پر ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں تو ایسے امور میں شریعتِ اسلامی کا منہج یہ ہے کہ وہ بنیادی قواعد و کلیات کا ذکر کرنے پر اکتفا کرتی ہے اور تفاصیل سے تعرض نہیں کرتی بلکہ یہ اُمت کے اہلِ علم اور اہلِ حل و عقد پر چھوڑ دیتی ہے کہ وہ بنیادی اُصولوں کی روشنی میں حسبِ ضرورت تفصیلات طے کرتے رہیں۔ نظامِ حکومت کا تعین اور اس میں تقسیم اختیارات کے مختلف اصول طے کرنا بھی اسی قبیل میں سے ہے کہ شارع نے سیاسی ڈھانچے سے متعلق بنیادی باتیں بتا کر تفصیلات سے تعرض نہیں کیا اور اسے اُمت پر چھوڑ دیا[1]، چنانچہ قرآن حکیم میں لفظ "مُلک" کے بعض لوگوں کی طرف انتساب سے ملوکیت کی حمایت نہیں کی جا سکتی اور نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں مرتکز ہر طرح کے دینی اور دُنیوی اختیارات سے یہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کا نظامِ حکومت ایسا ہونا چاہیے جس میں سارے اختیارات آپؐ کی طرح ایک شخص کے ہاتھ میں ہوں کیونکہ حضورؐ کا یہ تعامل بربنائے نبوت تھا اور نبوت آپؐ پر ختم ہو گئی[2]۔ لہٰذا اس معاملے میں شرعی نقطۂ نظر سے دلائل کا انحصار نصوص پر نہیں اجتہاد پر ہے چنانچہ ہم پہلے تعامل صحابہ کی کیفیت اور شرعی حیثیت پر

---

[1] ڈاکٹر عبدالحلیم محمود سابق شیخ الازہر فی مقدمہ "ازمۃ الفکر السیاسی الاسلامی فی العصر الحدیث" ص ۶
- شیخ عبدالمتعال الصعیدی فی "السیاسۃ الاسلامیۃ فی عہد الخلفاء الراشدین" ص ۵ طبع ۱۹۶۲
- ڈاکٹر ثروت بدوی فی "اصول الفکر السیاسی والنظریات والمذاہب السیاسیۃ الکبریٰ" ص ۱۱۵ طبع ۱۹۶۷۔

[2] بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے بعد کسی کو نامزد نہ کرنا اور قیادت کا فوری انتظام کیے بغیر اس دُنیا سے تشریف لے جانا، خود اس بات کی دلیل ہے کہ آنحضرتؐ نے عمداً اس کام کو مسلمانوں اور ان کے اہلِ حل و عقد پر چھوڑا ہے۔

گفتگو کریں گے اور پھر مصالح مرسلہ، سد الذرائع اور مقاصد الشریعہ جیسے فقہی قواعد کی روشنی میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کریں گے کہ ہمارے لیے صدارتی طرزِ حکومت کیوں غیر موزوں ہے۔

تعامل صحابہ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ خلافتِ راشدہ کے زمانے میں سارے اختیارات خلیفہ کی ذات میں جمع تھے اور چونکہ عام صحابہ اور سارے خلفائے راشدین کا یہ تعامل بلانزاع تھا اس لیے یہ اجماع اور ہمارے لیے حجت ہے۔ ہمارے نزدیک یہ دونوں دعوے محل نظر ہیں۔ اوّل تو یہ بات مبالغہ سے خالی نہیں کہ خلافتِ راشدہ کے زمانے میں سارے اختیارات خلیفہ کی ذات میں جمع ہوتے تھے۔ ہر حکومت میں تین شعبے ہوتے ہیں: عدلیہ، مقننہ اور انتظامیہ۔ اس میں جہاں تک عدلیہ کا تعلق ہے تو اس میں شک نہیں کہ شروع شروع میں انتظامی اور عدالتی عہدے یک جا تھے۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اپنی خلافت کے آخری زمانے میں کام کے بار کی وجہ سے، علیحدہ قاضی مقرر کرنے شروع کر دیے تھے[۱] اور بعد کی اسلامی تاریخ میں بھی قاضی کا عہدہ علیحدہ اور مستقل رہا۔ اسی طرح یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ انتظامیہ کے سربراہ کی حیثیت سے خلیفہ قاضیوں کا تقرر کیا کرتا تھا لیکن یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ تقرر کے علاوہ خلیفہ یا انتظامیہ کا عدالت پر کوئی اثر نہ تھا۔ قاضی آزادی کے ساتھ خلیفہ اور اس کی حکومتی پالیسیوں کے خلاف فیصلے کرتے تھے اور عدالتی کارروائی کی اساس اللہ تعالیٰ کی شریعت تھی، خلیفہ یا حکومت کا کوئی الگ دستور یا قانون نہ تھا۔ اگرچہ خلیفہ کو مجتہد ہونے اور انتظامیہ کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے عدالتِ مرافعہ کی حیثیت حاصل تھی، لیکن اس کے باوجود نہیں کہا جا سکتا کہ عدالتی نظام انتظامیہ کا ایک حصہ تھا یا خلیفہ کو عدالتی معاملات میں ہر بات پہ دسترس حاصل تھی۔

---

۱ ڈاکٹر عبدالمنعم البہی، تاریخ القضاء فی الاسلام، ص ۱۰۸، مطبعہ لجنۃ البیان العربی ۱۹۶۰ء

— ڈاکٹر شوکت علیان، السلطۃ القضائیہ۔ ص ۷۶، دار الرشید، الریاض۔

اسی طرح جہاں تک ان معاملات کا تعلق ہے جو ایک اسلامی مملکت میں "مقننہ" سے متعلق ہیں یعنی تفصیلی قواعد و ضوابط تشکیل دینے کا کام، احکام منصوصہ کی تنفیذ کے لیے اور اور ایسے اُمور میں فیصلے کرنے کے لیے جن میں شریعتِ حقّہ نے منصوص احکام نہیں دیئے ہیں (جسے آج کل "قانون سازی" سے تعبیر کیا جاتا ہے جو مغالطے سے خالی نہیں اور جسے شرعی اصطلاح کے مطابق اجتہاد کہا جانا چاہیے) تو خلافتِ راشدہ کے واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کام خلیفہ اکیلا اپنی مرضی سے یا محض حکومتی افسران کی مرضی اور مشورے سے انجام نہیں دیتا تھا بلکہ یہ کام اصحاب شوریٰ کے مشورے سے کرتا تھا اور شوریٰ میں قبیلوں کے شیوخ، سردارانِ قوم اور اہلِ علم صحابہ (مجتہدین) شامل تھے۔ جن اُمور کا تعلق مصالح عامہ سے ہوتا۔ اس میں مشورہ کا دائرہ کار بھی وسیع ہوتا اور جہاں مسئلہ علمی اور فقہی نوعیت کا ہوتا۔ وہاں انحصار فقہاء صحابہ کی رائے پر ہوتا۔ ان معاملات کے لیے خلافتِ راشدہ کے زمانے کی بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں، خاص طور پر حضرت عمرؓ کے زمانے کی (طاعون عمواس اور ارض سواد کا قضیہ وغیرہ) لیکن ان واقعات سے کہیں یہ پتہ نہیں چلتا کہ خلفائے راشدین ان معاملات میں اپنی مرضی چلایا کرتے تھے یا من مانی کیا کرتے تھے۔ بلکہ ان واقعات سے یہی مستنبط ہوتا ہے کہ وہ اہلِ شوریٰ کی رائے کا احترام کیا کرتے تھے اور اس کے خلاف نہ جاتے تھے[۱]

آیاتِ شوریٰ کی تفسیر میں مفسرین کی ایک بڑی جماعت نے شوریٰ کے فیصلوں کو امام کے

۱؎ ڈاکٹر عبد الحمید اسماعیل، الشوریٰ و اثرہا فی الدیموقراطیہ، ص ۱۴۰، المطبعۃ السلفیہ، القاہرہ۔
— ڈاکٹر محمد سلیم العوا، فی النظام السیاسی للدولۃ الاسلامیہ، ص ۱۹۸، المکتب المصری الحدیث، القاہرہ ۱۹۷۹۔
— ابوبکر الجزائری، الدستور الاسلامی، ص ۸، طبع المکتب الاسلامی۔
— ڈاکٹر عبد الکریم زیدان، مجموعہ بحوث فقہیہ، ص ۱۰۴، مکتبہ القدس ۱۹۷۶ء

لیے لازمی قرار دیا ہے[۱] اور امام قرطبی نے تو یہاں تک کہا ہے کہ جو امام اور سلطان شوریٰ کے فیصلوں کو نہ مانے اُس کا عزل واجب ہے[۲]۔ اور اگرچہ اس بات کا فیصلہ خلیفہ ہی کرتا تھا کہ مشورہ کس سے کیا جائے اور کب اور کس معاملے میں کیا جائے لیکن اس کے باوجود مذکورہ بالا تجزیے سے یہی پتہ چلتا ہے کہ "مقننہ" کے معاملات میں خلیفہ بالکل خود مختار نہ تھا۔ (اور قانون شریعت کی بالادستی تو حاکم اور محکوم سب کے لیے موجود ہی تھی) اور جب عدلیہ اور "مقننہ" دونوں میں خلیفہ کا کردار محدود تھا تو اس کا مطلب واضح ہے کہ اس کی اصل حیثیت انتظامیہ کے سربراہ کی تھی جسے بعض عدالتی اور پارلیمانی اختیارات حاصل تھے (جیسا کہ آج کل کی حکومتوں میں ہوتا ہے) لیکن وہ بہر حال ہر معاملے میں مختار کل نہ تھا۔

یہ اس معاملہ کا ایک پہلو ہے، دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر یہ مفروضہ مان بھی لیا جائے کہ خلافتِ راشدہ کے زمانے میں سارے اختیارات ایک خلیفہ کی ذات میں مرتکز تھے تو بھی یہ دلیل صحیح نہیں ہے کہ تقسیم اختیارات کا جو نظام خلافتِ راشدہ کے وقت رائج تھا اُسے من وعن اختیار کرنا ہمارے لیے ضروری اور محبت صحابہ کا عین تقاضا ہے کیونکہ صحابہ کرام کے قول و فعل کی قانونی لحاظ سے تین قسمیں ہیں۔ ایک وہ صورت جس میں اُن کا قول و فعل بعد میں آنے والے مجتہدین کے لیے لازمی طور پر قابلِ اتباع ہے، دوسری وہ صورت جس میں صحابہ کرامؓ کے لازمی اتباع پر ائمہ اور سلف میں اختلاف ہے اور تیسری وہ صورت جس میں صحابہ کرامؓ کے اجتہادی طرز عمل کا اتباع بعد میں آنے والے مجتہدین کے لیے ضروری نہیں ہے بلکہ اُن کے لیے جائز ہے کہ وہ ان اُمور میں نئے سرے سے اجتہاد کریں اب ہم ان تینوں صورتوں پر مختصر گفتگو کریں گے۔

۱؎ جامع القرآن عن تاویل آی القرآن، طبری، جلد ۷، ص ۳۴۴ طبع دار المعارف، مصر۔
— التفسیر الکبیر، رازی، جلد ۹، ص ۶۶، المطبعۃ البہیۃ المصریۃ، القاہرہ ۱۳۵۷ھ
۲؎ الجامع لاحکام القرآن، قرطبی، جلد ۴ ص ۲۴۹، طبع دار الکاتب العربی ۱۹۶۱ء

اوّلاً: صحابہ کرام کا قول و فعل دو صورتوں میں حجت اور لازمی طور پر قابلِ اتباع ہے ایک تو اس صورت میں کہ وہ کوئی بات اپنی عقل و رائے سے نہ کہیں اس صورت میں اسے سنّتِ نبوی سمجھا جائے گا۔ دوسرے یہ کہ مستقل[1] نوعیت کے کسی شرعی معاملے میں صحابہؓ کرام کا واضح اجماع ہو جائے[2]۔ اب آیئے خلفاء راشدین کے زمانے کے واقعات کا تجزیہ کر کے دیکھیں کہ طرزِ حکومت اور تقسیم اختیارات کے مسئلے میں کیا وہ متفق الرائے تھے اور کیا ان معاملات میں کوئی اجماع واقع ہوا ہے؟

۱۔ حضرت ابوبکرؓ کا انتخاب ایک بڑے پبلک اجتماع میں لمبی بحث و تمحیص کے بعد صحابہ کرامؓ نے کیا[3]۔ لیکن انہوں نے انتقالِ اقتدار اور نئے خلیفہ کے تقرر کے لیے اس طریقے کو پسند نہیں فرمایا جس سے وہ خود منتخب ہوئے تھے۔ بلکہ انہوں نے کبار صحابہ سے مشورے کے بعد حضرت عمرؓ کو نامزد فرمایا اور تمام لوگوں سے اس امر کی رضامندی حاصل کی۔ حضرت عمرؓ نے شہادت کے وقت حضرت ابوبکرؓ کے طریقے پر عمل نہیں فرمایا، بلکہ چھ افراد پر مشتمل ایک کمیٹی قائم کر دی۔ حضرت عثمان کی شہادت کے بعد جب لوگوں نے حضرت علیؓ کو خلافت سنبھالنے کو کہا تو انہوں نے کہا کہ یہ تمہارا نہیں اہل بدر اور دوسرے کبار صحابہ کا کام ہے۔

۲۔ حضرت عمرؓ جب خلیفہ بنے تو آپ نے وظائف کی تقسیم اور مؤلفۃ القلوب کے سلسلے میں حضرت ابوبکرؓ کی پالیسی ختم کر کے نئی پالیسی وضع کی۔ حضرت عمرؓ ہی کا ایک واقعہ ہے کہ ایک قضیہ طلب صحابی نے آپ سے رجوع کیا۔ آپ نے اُسے قاضی کے پاس بھجوا دیا

---

[1] کیونکہ اجماع کے بارے میں بھی عمومی قاعدہ یہی ہے کہ اگر وہ وقتی مصالح یا اعراف پر مبنی ہو تو حالات اور عرف کے بدل جانے کے بعد نیا اجماع پہلے اجماع کی جگہ لے لے گا۔ ملاحظہ ہو: اسلام عقیدہ و شریعہ للشیخ محمود شلتوت، سابق شیخ الازہر، صفحہ ۵۷۷ طبع دار المشروق ۱۳۹۷ھ

[2] کیونکہ اجماع سکوتی کے حجت ہونے کے بارے میں ائمہ میں اختلاف ہے۔

[3] جس سے بعض صحابہؓ نے کھلم کھلا اختلاف کیا۔

جس نے فیصلہ کر دیا، کچھ دنوں بعد آپ کی اس شخص سے ملاقات ہوگئی تو پوچھا کہ تمہارے قضیے کا کیا بنا؟ اُس نے کہا قاضی نے یہ فیصلہ کیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر میں ہوتا تو اس کی جگہ یہ فیصلہ کرتا۔ اُس شخص نے کہا کہ آپ کی رائے کے نافذ ہونے میں کیا مانع ہے؟ (کہ آپ تو امیرالمومنین ہیں) آپ نے فرمایا نہیں، قاضی کی بھی رائے ہے اور میری بھی رائے ہے، جب حکم منصوص نہیں ہے تو پھر میری اور اس کی رائے میں کیا امتیاز ہے؟

۳ ــ حضرت عمرؓ اپنے اعزہ کو سرکاری مناصب دینے سے اجتناب کرتے تھے، اس کے برعکس حضرت عثمانؓ نے اس پالیسی کی مخالفت کرتے ہوئے سرکاری مناصب فیاضی سے امویوں کو دیئے، گورنروں کی تقرری کا جو معیار حضرت عمرؓ نے مقرر کر رکھا تھا حضرت عثمانؓ نے اس کی بھی پیروی نہیں کی۔

۴ ــ حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد جب خلافت کمیٹی کے اجلاس شروع ہوئے اور باقی لوگوں کے کنارہ کش ہونے کے بعد میدان میں حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ رہ گئے تو حضرت عبدالرحمن بن عوف نے (جو ثالث تھے) دونوں امیدوارانِ خلافت سے عہد لینا چاہا تو وہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی پالیسیوں پر عمل کریں۔ حضرت عثمان نے عہد لے لیا لیکن حضرت علیؓ نے انکار کر دیا۔[1]

۵ ــ ارضِ سواد کے قضیے میں صرف حضرت بلالؓ، حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ اور دوسرے کئی جلیل القدر صحابہؓ نے حضرت عمرؓ کی رائے کو صحیح تسلیم نہیں کیا، خود حضرت عمرؓ نے مولفۃ القلوب کے سلسلے میں وہ "صک" پھاڑ دیئے جو حضرت ابوبکرؓ نے جاری کیے تھے۔ حضرت عائشہؓ، طلحہؓ اور زبیرؓ نے قتلِ عثمانؓ کے بارے میں حضرت علیؓ کے موقف کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اُن سے جنگ کی۔ حضرت امیر معاویہؓ نے

---

[1] خدانخواستہ اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ حضرت علیؓ کو شیخین کا راستہ پسند نہ تھا بلکہ اس کا مطلب صرف یہ تھا کہ وہ خود صاحب الرائے اور مجتہد ہیں۔ اپنی حکومتی پالیسیاں خود بنائیں گے اور ضروری نہیں ہے کہ شیخین ہی کی وضع کردہ پالیسیوں پر عمل کریں۔

اسی معاملے میں حضرت علیؓ کے موقف کو رد کر دیا اور خونریز لڑائیاں ہوئیں۔ خوارج حضرت علیؓ کو گالیاں دیتے اور قتل کی دھمکیاں دیتے تھے۔ لیکن آپ نے کبھی ان کے خلاف کارروائی نہیں کی جب تک کہ انہوں نے جنگ میں پہل نہیں کی۔ مسجد نبوی میں منبر رسولؐ پر بیٹھتے ہوئے حضرت عمرؓ نے جب کہا کہ سنو اور اطاعت کرو تو ایک صحابی نے اٹھ کر کہا کہ ہم اس وقت تک تمہاری اطاعت نہیں کریں گے جب تک تم یہ نہ بتاؤ کہ یہ قمیص جو تم نے پہن رکھی ہے اس کا کپڑا تم نے بیت المال سے بغیر استحقاق کے تو نہیں لے لیا۔ اسی طرح ایک مجلس میں ایک عام صحابی نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ اگر تم ٹیڑھے ہوئے تو ہم اپنی تلواروں سے تم کو سیدھا کر دیں گے۔

ان واقعات سے جو نتائج اخذ ہوتے ہیں وہ یہ ہیں:-

— انتقال اقتدار اور نئے حکمران کے انتخاب و تعین کے بارے میں، نیز مالی، سیاسی اور انتظامی پالیسیوں کے بارے میں اور حکومتی طرزِ عمل کے بارے میں ہر خلیفہ راشد کی اپنی ایک رائے تھی جو دوسرے مختلف تھی۔

— خلفاء راشدین نے کبھی اپنے آپ کو مختار کل نہیں سمجھا اور نہ صحابہ کرامؓ نے کبھی ان کو مطلق العنان گردانا، وہ کھلم کھلا ان پر تنقید کرتے اور ان کی پالیسیوں کی مخالفت کرتے تھے۔

— طرزِ حکومت اور تقسیم اختیارات کے سلسلے میں صحابہ کرام کا یا خلفاء راشدین کا کوئی اجماع واقع نہیں ہوا، بلکہ ان سب کے طرزِ عمل سے جو بات مستنبط ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ان امور میں اختلاف جائز ہے اور انہوں نے ایک دوسرے سے اختلاف کیا ہے۔

— طرزِ حکومت اور تقسیم اختیارات کے سلسلے میں صحابہ کرامؓ کا نہ واضح اجماع ہوا ہے اور نہ سکوتی۔ رہا مجرد تصرف اور فعل تو خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال بھی، سارے اصولیوں کے نزدیک، شرعی نقطہ نظر سے وجوب پر نہیں بلکہ اباحت پر دلالت کرتے ہیں چہ جائیکہ صحابہ کرامؓ کے افعال کو واجب گردانا جائے۔

ثانیاً:۔ وہ شرعی اُمور جن میں صحابہ کرامؓ کے فیصلے انفرادی اجتہاد پہ مبنی ہوں اور جن میں ان کا اجماع نہ ہوا ہو بلکہ آپس میں اختلاف ہو اُن کے بارے میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کی یہ رائے ہے کہ کسی ایک صحابی کی رائے اختیار کر لی جائے اور مجموعی آراء کو رد نہ کیا جائے۔[1] اگرچہ احناف میں سے امام بزدوی اور کرخی نے، فروع میں امام کی تطبیقات سے امام کا یہ موقف مستنبط کیا ہے کہ صحابیؓ کی رائے سے مختلف رائے قائم کی جاسکتی ہے[2]۔ جب کہ امام شافعیؒ اور امام احمد کی ایک روایت یہ ہے کہ بعد کے اہلِ علم کے لیے صحابہ کرام کی اجتہادی آرا حجت نہیں ہیں[3]۔ اصولیوں میں سے امام غزالی اور آمدی نے اسی نقطہ کی شدومد سے حمایت کی ہے اور مخالفین کے اعتراضات کا ایک ایک کر کے جواب دیا ہے[4]۔

ثالثاً:۔ ایسے امور جن میں صحابہ کرام کا اجتہاد یا اُن کی کوئی پالیسی وقتی مصلحتوں پہ مبنی ہو یا اُس زمانے کی مخصوص ضروریات اور عرف کے مطابق ہو، ان اُمور میں تغیر کے بعد صحابہ کرام کے اجتہادات کی پیروی لازمی نہیں، بلکہ نئے حالات اور ضروریات کے مطابق نئے سرے سے اجتہاد کیا جاسکتا ہے۔ انتظامی، معاشی، معاشرتی اور سیاسی اُمور کے بارے میں خلفاء راشدین کے فیصلے اسی قبیل میں سے ہیں[5]۔

---

[1] تاریخ بغداد للخطیب بغدادی ج ۱۳ ص ۳۶۸، مکتب الخانجی، ۱۳۴۹ھ۔

[2] کشف الاسرار ج ۳ ص ۹۲۷، دار الکتاب العربی ۱۳۹۴ھ۔

[3] الرسالۃ للشافعی ص ۵۹۷ تحقیق احمد شاکر۔ دار التراث القاہرہ۔

[4] الاحکام فی اصول الاحکام للآمدی ج ۴ ص ۲۰۱ دار الکتب العلمیہ بیروت۔

— المستصفیٰ للغزالی ج ۱ ص ۲۶۰ طبع دار صادر۔

[5] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو:

— الاحکام فی تمییز الفتاویٰ عن الاحکام ص ۲۳۱، ۲۴۹، مکتب المطبوعات الاسلامیہ ۱۹۶۷ م

(باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

اس وضاحت سے صاف ظاہر ہے کہ طرز حکومت اور تقسیم اختیارات کا مسئلہ نہ تو منصوص ہے اور نہ صحابہ کرام کا کسی خاص طرز حکومت پر یا تقسیم اختیارات کی کسی شکل پر اجماع واقع ہوا ہے کہ اس کی پیروی ہم پر واجب ہو بلکہ یہ مسئلہ تو تیسری صورت سے تعلق رکھتا ہے کہ ہر خلیفہ راشد نے مقامی ضرورتوں اور حالات کے مطابق ان امور پر فیصلہ کیا ہے اور ہمارے لیے ان کا اتباع یہی ہے کہ ہم بھی اپنے حالات اور ضروریات کے مطابق ان امور میں فیصلے کریں۔ (باقی)

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

— اعلام الموقعین لامام ابن قیم جلد ۳ صفحہ ۳ و جلد ۴ صفحہ ۲۲۸ طبع دار الجیل ۱۹۷۳م

— الفروق للقرافی جلد ۱ ص صفحہ ۴۴، طبع دار المعرفہ بیروت ۱۳۴۲ھ

— ڈاکٹر عبداللہ ترکی، اصول مذہب الامام احمد صفحہ ۶۶۸، جامعہ عین شمس ۱۹۷۴م

— ڈاکٹر محمد سلام مدکور، مناہج الاجتہاد ص ۱۸۳، جامعہ کویت

— ڈاکٹر محمد سلیم العوا، فی النظام السیاسی للدولۃ الاسلامیہ، ص ۲۴۰

اپنا احتساب آپ

(۱۹۸۳ء کے چہرے کے بدنما داغ)

اخذ و اقتباس از شیخ افتخار احمد۔ ترتیب و تہذیب نعیم صدیقی

سالِ رفتہ پر نگاہِ بازگشت ڈالنے کا مقصود نہ تو خالصتاً سیاسی ہے اور نہ کسی فرد یا ادارے کی مذمت۔ بلکہ مدعا یہ ہے کہ پورا معاشرہ اور اس کے دینی پیشوا اور سیاسی رہنما اور اہلِ قلم مسلمان ہونے کے نقطۂ نظر سے یہ سوچیں کہ پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کا راستہ کیا یہی ہے اور اس کا تدارک حکومت اور معاشرے کو کس طرح کرنا چاہیے تاکہ چاروں طرف سے مشکلات میں گھرا ہوا یہ ملک خدا کی گرفت سے بچ سکے۔ (ادارہ)

الحمرا آرٹ سنٹر سنٹر میں روسی ثقافتی طائفے کا مظاہرہ ہوا۔ طائفے میں ۸ رقاصائیں، ڈانس ڈائرکٹر، ۹ موسیقار اور فنونِ لطیفہ سے متعلق دوسرے لوگ بھی تھے۔ روس کے علاقائی رقص پیش کئے گئے۔ حاضرین نے بے پناہ داد دی۔ ملک اللہ یار خاں صوبائی وزیر مہمانِ خصوصی تھے۔[1]

(امروز۔ ۱۴ جنوری ۱۹۸۳ء)

[1] نوائے وقت ۱۴ دسمبر ۱۹۸۲ء کی جائزہ یا تبصرہ رپورٹ میں توجہ دلائی جا چکی تھی کہ آرٹ کونسلوں میں ہونے والے ڈراموں میں ذومعنی مکالموں، فحش حرکات اور گھٹیا مزاح کے عناصر میں کمی ہونے کے بجائے زیادتی ہوئی ہے۔ ان ڈراموں کی جانچ پڑتال بھی خود آرٹ کونسلوں کے حکام کرتے ہیں۔

مزلہ کا رقص اوچ شریف (ضلع بہاول پور) میں ایک نمایاں شخصیت، جو ضلع کونسل بہاول پور کے رکن بھی ہیں، ان کے بیٹے کی رسم ختنہ پر پاکستان کی رقاصہ مزلہ کا رقص پیش کیا گیا جس میں اسے ۷۰ ہزار روپے بطور سلامی ملے۔ (مراسلہ جنگ لاہور - ۲۵ فروری ۸۳ء)

غم و غصے کا اظہار صوبائی دارالحکومت کے سماجی رہنماؤں نے احتجاج کیا ہے کہ بازارِ حسن (یا بازارِ گناہ۔ ایڈیٹر) کی تنظیم کی رجسٹریشن کر لینے پر غم و غصے کا اظہار کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اسلامی مملکت میں گناہ (اور کاروبارِ گناہ! ایڈیٹر) کو قانونی تحفظ دینا افسوسناک ہے۔ مزید برآں مطالبہ کیا گیا ہے کہ مذکورہ رجسٹریشن کو فوری طور پر منسوخ کر دیا جائے اور عصمت فروشی، گانے بجانے اور ناچ رنگ کو ممنوع قرار دیا جائے۔ (مشرق - ۹ مارچ ۸۳ء)

سعیدہ گزدر کی آزاد نظم خواتین محاذِ عمل کے جلسے میں ڈاڑھی اور علماء کا مذاق اڑایا گیا۔ ایک خاتون سعیدہ گزدر نے ایک آزاد نظم پڑھی جس میں زنا کے مجرم کو مظلوم بنایا گیا، اور شادی بیاہ کا مذاق اڑایا گیا۔ اس جلسے میں ماہرِ قانون جناب خالد اسحٰق نے کہا آپ مسلم معاشرے کی خواتین ہیں۔ آپ کے پلیٹ فارم سے کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ زنا کرنے والے شخص کو قابلِ قدر قرار دے۔ (جسارت کراچی - ۹ مارچ و اداریہ ۱۰ مارچ ۸۳ء)

اپوا اپوا کی طرف سے اسلامی قانونِ شہادت پر نکتہ چینی کی گئی۔ بیگم رعنا لیاقت علی خاں نے جنرل ضیاء الحق سے اپیل کی کہ عورتوں کو مردوں کے برابر رتبہ دیا جائے۔

(ڈان کراچی - ۲۰ مارچ ۸۳ء)

چمنگ انجینئرنگ یونیورسٹی کے مجلّے چمنگ میں اخلاق سوز مواد (ص ۲۱، ص ۱۵۸) کی اشاعت۔ دو مضامین دین اسلام کے بارے میں ذہنوں کو الجھا دینے والے ہیں۔ ص ۵۹، ۶۱ اور ۹۷ پر فحش کلمات درج ہیں۔ یہ رسالہ شعبہ کیمیکل کے چیئرمین اے۔ ایچ۔ بانڈے کی زیرِ نگرانی شائع ہوا۔ (امروز - ۷ اپریل ۸۳ء)

خیرپور میں کاروبارِ شر ثقافتی سیمینار کے موقع پر سکھر کے کل پاکستان مشاعرے میں کمیونزم کا پرچار کرنے کے علاوہ ملکی سالمیت کے خلاف نغمے پیش کیے گئے۔ اسلامی ہیروز کا مذاق اڑایا گیا۔ افسرانِ حکومت ایسی مخلوط (مرد و زن) محفلیں منعقد کر رہے ہیں جن میں چادر اور چاردیواری

کے تقدس کی دھجیاں اُڑائی جاتی ہیں۔ سکھر کے مشاعرے میں بے پردہ نوجوان خواتین نے کلام سنایا اور اس ضمن میں ہزاروں افراد کے مخلوط مجمع میں فحش فقرے بازی ہوئی اور بے حیائی کی فضا بن گئی۔ حکیم الامت علامہ اقبالؒ کا مذاق اُڑایا گیا۔

(جسارت کراچی۔ ۲۰ر اپریل ۱۹۸۳ء)

پروگرام منسوخ جشنِ خیبر کے بعض پروگراموں میں بے حیائی کے پیش نظر عورتوں کے میلے کا پروگرام منسوخ کر دیا گیا۔ علما کے احتجاج پر سرکس شو بھی بند کر دیے گئے۔ تین گھنٹوں تک جشن کے اسٹالوں کا بائیکاٹ کر دیا گیا۔ اس سلسلے میں سرکاری اعلان بھی شائع ہوا۔

(روزنامہ امروز۔ پشاور یکم مئی ۱۹۸۳ء)

عورتوں کے ہاکی میچ کا اعلان پاکستان اور آئرلینڈ کی زنانہ ٹیموں کے درمیان ہاکی میچ کے اعلان پر اظہارِ حیرت کہ بند دروازہ اب کھول دیا گیا ہے اور موجودہ حکومت نے ترقی پسند اور مغرب نواز عورتوں کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے ہیں۔ تحریکِ اسلامی کے رہنماؤں نے احتجاج کیا

(جسارت کراچی، خبر ۲۶ر مارچ، اداریہ ۲۷ر مارچ ۱۹۸۳ء)

خواتین کے ٹریننگ کالج میں فیشن شو گورنمنٹ ٹریننگ کالج برائے خواتین لاہور میں فیشن شو ہوا جس میں طالبات نے معلمات کی سرپرستی میں لوک رقص، لڈی اور دیگر ناچ پیش کیے مشاعرہ بھی منعقد ہوا۔ اس تقریب کی کامیابی کی خوشی میں ایک دن کی تعطیل کی گئی۔

(جسارت کراچی۔ ۲۸ مارچ ۱۹۸۳ء)

سیلی بربج کی تقریر ویمن ایکشن فورم کے اجلاس میں آسٹریلوی خاتون سیلی بربج نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ پاکستانی خواتین خود کو کمتر سمجھتی ہیں۔ ترقیاتی کاموں میں عورتوں کو شامل کرنے کا رویہ تو درست ہے۔ لیکن عورتوں کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ محنت کش عورتوں کو پردے یا چادر کا حکم دیا جاتا ہے جو ان عورتوں کے لیے ممکن نہیں[1]۔

---

[1] یعنی بجائے اس کے کہ اسلامی معاشرے کی خواتین دوسرے ممالک میں جا کر اسلام کے تصوّرِ نسائیت کی تبلیغ کرتیں، اُلٹا وہ خود اپنے اجلاسوں میں تہذیب الحاد و ر(باقی بر صفحہ آئندہ)

مغربی خواتین کی تحریک کے بارے میں یہاں کے لوگوں کو زیادہ علم نہیں اور اپنی بے علمی کی وجہ سے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ مغربی عورت صرف جنسی آزادی چاہتی ہے۔ حقیقت میں یہ بات بالکل غلط ہے۔ انہوں نے کہا کہ آسٹریلیا میں گھرداری اور بچوں کی پرورش کی ذمہ داریوں کو عورتوں تک محدود کرنے کے بجائے عورتوں اور مردوں پر برابر تقسیم کیا جاتا ہے [1]

(جنگ لاہور۔ ۳۱ مارچ ۱۹۸۳ء)

انڈسٹریل ایریا گلبرگ یوم مئی کے سلسلے میں آج رات انڈسٹریل ایریا گلبرگ میں خواتین مجلسِ عمل، ویمن ایکشن فورم اور آل پاکستان ٹریڈ یونین کی جانب سے ایک ثقافتی پروگرام کا اہتمام کیا گیا۔ پروگرام میں متعدد صنعت کاروں، سرکاری افسروں اور وکلا کے علاوہ معروف شخصیات کی بیگمات، بیٹوں اور بیٹیوں نے شرکت کی۔ پاکستان کی علاقائی زبانوں میں لوک گیت پیش کیے گئے جنہیں لڑکوں اور لڑکیوں نے مل کر گایا۔ پھر انہوں نے مل کر ۳ ڈرامے ڈرامے پیش کئے۔ آخر میں لڑکیوں اور لڑکوں نے موسیقی کی دھنوں پر ڈانس کیا اور "دھمال" ڈالی۔ مخلوط ناچ کا یہ سلسلہ ۱۵ منٹ جاری رہا۔ وہ اس دوران میں " سوشلزم آوے ای آوے" کے نعرے بلند کرتے رہے۔ (نوائے وقت لاہور۔ ۳ مئی ۱۹۸۳ء)

سیٹھ کے لڑکے کی شادی کشمور میں ایک سیٹھ کے لڑکے کی شادی کے موقع پر شراب اور

(بقیہ حاشیہ سابقہ سابقہ)

اخلاق باختہ معاشروں کی خواتین کو بلا کر ان سے وعظ سنتی ہیں اور زندگی کے طور طریقے سیکھتی ہیں۔ مقام عبرت ہے۔ کاش کہ تہذیب جدیدہ سے بغاوت کرنے والی خواتین اور طالبات ایک کثیر تعداد میں اُٹھ کھڑی ہوں اور تہذیب الحاد کی مبلغات سے صاف صاف کہہ دیں کہ ہمارے عقائد، نظامِ حیات اور تصورِ نسائیت تم سے اتنا مختلف ہے کہ اسلامی تصورات اور مغربی تصورات میں ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے۔

[1] فطرت کی اس عدم مساوات کا کیا علاج کہ بچے جننے اور اُن کو دودھ پلانے میں مرد برابر کا حصہ دار نہیں بن سکتا۔

رقص و سرود کا ہنگامہ رات بھر جاری رہا - اس موقع پر حکومت کو بھی تضحیک کا نشانہ بنایا گیا - گانے والیوں کو ہزاروں روپے دیئے گئے - (جسارت کراچی - ۹ رمئی ۱۹۸۳ء)

درِ میخانہ پھر کھُلا شہداد پور میں بند کیا جانے والا شراب خانہ دوبارہ کھول دیا گیا، اس طرح اقلیتوں کی آڑ میں مسلمانوں کو بھی لذتِ بادہ کشی کا دوبارہ موقع مل گیا -

(جسارت کراچی - ۹ رمئی ۱۹۸۳ء)

قومی ترقیاتی ورکنگ گروپ کی سفارش آئندہ پانچ سالہ چھٹے ترقیاتی منصوبے کے لیے یہ سفارش کی گئی ہے کہ ملک میں خانہ دار خواتین کو پردے سے آزاد کر دیا جائے تاکہ ان سے ترقیاتی کاموں میں مدد لی جا سکے - (تمام اخبارات - ۱۸ رمئی ۱۹۸۳ء)

نوائے وقت کی آواز متذکرہ خبر کے سلسلے میں نوائے وقت نے تفصیلی اداریہ لکھتے ہوئے یہ کہا کہ صدر جنرل محمد ضیاء الحق اور ان کے رفقائے کار کو اس بات کا جائزہ لینا چاہیے کہ مغرب نواز حلقوں کو ترقیاتی منصوبے کے نام پر خواتین کو پردے سے باہر لانے کی سفارش کرنے کی جرأت و ہمت کس طرح ہوئی - (نوائے وقت - ۱۹ رمئی ۱۹۸۳ء)

میوزیکل اسٹیج شو ٹنڈو آدم کے تعلیمی ادارے مراکزِ رقص و سرود بن رہے ہیں - اعلان کیا گیا کہ شاہ لطیف ہائی اسکول میں ۲ رجون کو میوزیکل اسٹیج شو ہوگا جس میں ڈسکو ڈانس اور رقص و سرود کے دوسرے پروگرام ہوں گے - شہر میں جگہ جگہ اس محفل کے اشتہارات اور بینرز لگے ہوئے ہیں - اس پر شہریوں کی طرف سے شدید احتجاج کیا گیا - (جسارت کراچی ۱۹ رمئی ۱۹۸۳ء)

بے پردگی یہ ایک استثنائی صورت ہے کہ اسلام ایسی خواتین کو معاشی خود کفالتی سرگرمی اختیار کرنے سے نہیں روکتا جن کی کفالت کے لیے مرد موجود نہ ہوں یا مرد بوجوہ معذور ہوں یا نادار، (اور جن کو گھر میں کرنے کا کوئی کام بھی نہ مل سکتا ہو) لیکن سیکولر مغرب کے مخلوط معاشرے کو ماڈل بنا کر پردے کو مزاحم سمجھنا اور اُسے ترک کرنے کی سفارش کرنا اللہ کے دین سے بغاوت ہے یا جہالت! (اس فیصلے پر ہر طرف سے احتجاج ہوا - (اداریہ جسارت - ۲۰ رمئی ۱۹۸۳ء)

خواتین کرکٹرز کا مطالبہ لاہور کالج برائے خواتین میں چھٹے قومی ویمن کپ ٹورنامنٹ کے اختتام پر خواتین کرکٹرز نے مطالبہ کیا کہ اگر حکومت مردوں کے کرکٹ کی تشہیر قومی نشریاتی رابطے پر ٹیلی وژن

اور ریڈیو کے ذریعے کرتی ہے تو خواتین کے کرکٹ کی بھی اسی طرح تشہیر ہونی چاہیے۔
(روزنامہ جنگ۔ ۲۲ مئی ۱۹۸۳ء)

پردہ اٹھانے کے معنی | متذکرہ قضیے کے متعلق وضاحتی بیان دیتے ہوئے بیگم سلیمہ احمد کی طرف سے کہا گیا ہے کہ پردہ ہٹانے سے مراد کارکن خواتین کے اعداد و شمار پر سے پردہ اٹھانا ہے۔ بعض معزز لوگوں نے اصل مسودہ کو پڑھے بغیر تنازعہ کھڑا کر دیا ہے۔ (جنگ لاہور ۲۴ مئی ۱۹۸۳ء)

کراچی جم خانہ | اعلان کہ ۳ جون کو ۸ بجے شب کراچی جم خانہ میں حسب ذیل پروگرام ہوگا: "جیم شین" کے نام سے رقص و موسیقی کا پروگرام بھی رکھا گیا ہے۔ یہ تقریبات صرف ممبرز کے لیے ہیں، البتہ ان کی بیویاں اور ۱۲ سے ۲۱ سال تک کی عمر کے بچے بھی شرکت کر سکتے ہیں۔ ایک رکن ایک جوڑے کو بطور مہمان بھی لا سکتا ہے۔ کئی بیوروکریٹس اس کے ممبر ہیں۔ (شہریوں کی طرف سے احتجاج)
(روزنامہ جسارت۔ ۳ جون ۱۹۸۳ء)

راشن ڈپو ہولڈر کے بیٹے کی شادی | سجاول میں ایک مقامی راشن ڈپو ہولڈر کے بیٹے کی شادی کی تقریب میں رات بھر محفل رقص و سرود جاری رہی۔ اول تا آخر شراب استعمال ہوتی رہی۔ اس تقریب میں سرکاری افسران مختلف تنظیموں کے رہنماؤں اور معززین شہر نے بھی شرکت کی۔
(جسارت ۱۶ جون ۱۹۸۳ء)

ٹنڈو آدم میں خاص شادیاں | یہاں ایک تقریب شادی میں رات بھر محفل رقص و سرود پوری بیہودگی کے ساتھ جاری رہی۔ فاحشہ عورتوں کو ۸۰ ہزار روپے بطور انعام ملے۔ اسی طرح چند دن پہلے دو بھائیوں کی شادی کی تقریب میں سندھ کے اعلیٰ سرکاری افسران، حکام اور رکن شوریٰ نے شرکت کی، اس موقع پر تین فاحشہ عورتوں نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ شراب کا انتظام بھی موجود تھا۔
(جسارت۔ ۹ جون ۱۹۸۳ء)

لغویات کا سیلاب | عید کا چاند نظر آنے کے ساتھ ہی پاکستان ٹیلی وژن اور ریڈیو پر لغویات کے سیلاب کا بند ٹوٹ گیا۔ بیہودہ پروگرام شروع ہو گئے۔ پاکستان ٹی وی پر کل شب ایک انگریزی فلم "دی پرامز" (THE PROMISE) دکھائی گئی اور عریانی و فحاشی کے تمام ریکارڈ توڑ دیئے گئے۔ پاکستان میں پہلی بار فلم میں بوس و کنار کے مناظر دیدہ دلیری سے دکھلائے گئے۔ (اداریہ جسارت۔ ۱۷ جولائی ۱۹۸۳ء)

سندھ کا اصل بگاڑ پاکستان خدمت گار رابیوسی ایشن کے صدر نے گورنر سندھ، کمشنر حیدرآباد اور مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کو توجہ دلاتے ہوئے یہ کہا کہ ضلع ٹھٹھہ میں اور خصوصاً اندرون سندھ عموماً غریب ہاریوں کی جوان عمر بیٹیوں کو وڈیروں کے غنڈے اغوا کر لے جاتے ہیں، ہاریوں کی کوئی شنوائی نہیں ہوتی۔ ملزم دندناتے پھر رہے ہیں اور ان کے ہاں بے نکاحی عورتوں سے حرام اولاد پیدا ہو رہی ہے۔ (اداریہ جسارت - ۲۸ رجون ۱۹۸۳ء)

خواتین چڑیا گھر میں عید کی تعطیلات میں سیر و تفریح کے لیے چڑیا گھر آنے والی خواتین جب ہاتھی گھر کے سامنے پہنچیں تو اچانک بارش شروع ہو گئی۔ اس حالت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے غنڈہ عناصر نے خواتین کو چھیڑنا شروع کیا۔ ان کے دوپٹے اور کپڑے پھاڑ دیئے۔ جن لوگوں نے ان خواتین کو بچانے کی کوشش کی، غنڈوں نے حملہ کر کے ان کو بھی زخمی کر دیا۔ پولیس والوں نے مداخلت کی تو غنڈوں نے ان پر بھی ہلہ بول دیا۔ خواتین کے چہروں اور جسموں پر زخموں اور خراشوں کے نشان بھی دیکھے گئے۔ بیچاری زار و قطار رو رہی تھیں۔ بعض نیک دل افراد نے ان کو چادریں اور پردے لا کر دیئے۔ پھر انہیں چڑیا گھر سے نکال کر ان کے گھروں کو روانہ کیا۔ ان میں سے ایک خاتون کا تعلق ایک اعلیٰ سرکاری افسر سے تھا، مگر مزید بے عزتی سے بچنے کے لیے رپورٹ درج نہیں کرائی۔[۱]

(رپورٹ نوائے وقت لاہور ۲۵ رجولائی - اداریہ ۲۶ رجولائی ۱۹۸۳ء)

(بقیہ اشاعت آئندہ میں)

۱۔ غنڈہ گردی سخت قابل نفرین، مگر کبھی کسی نے سوچا کہ خواتین کی بر سرِ عام جلوہ فرمائی اور خصوصاً مخلوط اداروں (بلکہ میلوں اور تماشوں) میں بے محابا شرکت کیا معاشرے کے اندر لوگوں کی تند و تیز جبلتوں کو نہیں بھڑکاتی۔ چڑیا گھر یا دوسری سیر گاہوں میں عورتوں کا الگ دن رکھا جا سکتا ہے اور پھر ان کو ان موقعوں پر غیر معمولی فاخرہ لباسوں اور زیوروں اور میک اپ کی کیا ضرورت ہوتی ہے۔ سیدھی سادی زندگی گزاری جائے تو مرد بھی زیادہ تر پاگل نہیں بنیں گے اور خواتین بھی سکھ چین سے رہیں گی۔ خدا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کو جو معاشرہ نہ مانے اس میں گھٹیا جذبات کو فروغ ملتا ہے اور تباہی کا باعث بنتا ہے۔ (ن - ص)

رسائل ومسائل

حقیقتِ محمدیہ

مولانا عبدالمالک صاحب - شعبہ استفسارات - منصورہ - لاہور

سوال:- آپ کے ملاحظہ کے لیے کچھ مواد خط کے ہمراہ ارسال خدمت ہے۔ مہربانی کرکے اس کا نہایت باریک بینی اور خاص توجہ سے جائزہ لے کر اس کے بارے میں ذرا مفصل عالمانہ، محققانہ اظہار رائے فرمائیں۔ بہتر ہوگا کہ اس کو ترجمان القرآن کی کسی قریبی اشاعت میں چھپوانے کا اہتمام فرمائیں اور اگر ممکن ہو تو اصل تحریر کنندہ کو مخدوم رشید کے پتہ پر بھی اپنے جواب باثواب سے آگاہ فرمائیں۔ نوازش ہوگی۔ علامہ ابوالخیر اسدی صاحب مخدوم رشید (یا ارشد ہوسکتا ہے، تحریر صاف نہیں - مدیر) حقانی خاندان میں سے ہیں۔ گریجوایٹ ہونے کے علاوہ بغداد یونیورسٹی میں بھی چند سال تک قرآن کے خصوصی مطالعہ کا ایک کورس بھی پاس کیا ہوا ہے۔ قرآنِ پاک کی آفاقیت پر ریسرچ اسکالر ہیں۔ اپنی خصوصی تحقیق کا حاصل اپنے شہر کے علاوہ ضلع کے گرد و نواح میں بھی نشر کرتے رہتے ہیں۔ تحریک اسلامی کے حامیوں میں سے ہیں[1]۔ ان کا بڑا صاحبزادہ باقاعدہ تحریک اقامتِ دین کا متفق ہے۔ امیر ضلع ملتان کئی بار وہاں جاچکے ہیں۔ ان کے تحریر کردہ پمفلٹ ملتان کے جماعتی مکتبہ میں بھی دستیاب ہوتے ہیں۔ یہاں مخدوم پور میں بھی دو بار تشریف لاکر درس کلام پاک دے چکے ہیں۔ راقم الحروف نے ان کا تعارف

[1] ہم ہر اس شخص کے قدردان ہیں جو دینِ حق اور تحریک اسلامی کے ساتھ تعاون یا حمایت کا تعلق رکھتا ہو۔ (ن-ص)

منصورہ کے اصحابِ علم و فضل سے کرا دیا ہے۔ خصوصاً مولانا گلزار احمد صاحب مظاہری اور جناب مولانا نعیم صدیقی صاحب سے بالعموم اب تک وہاں سے ان کے ساتھ کوئی رابطہ کیوں نہ پیدا کیا جا سکا۔[۱] میرے خیال میں اگر اُن کی تحقیق کی کچھ افادیت محسوس فرمائیں تو اس کے متعلق ضرور بیان فرمائیں۔ اُمید ہے کہ اصل مسئلہ کی گرہ کشائی سے باہم فرقہ وارانہ اختلاف کو ختم کرنے میں مدد ملے گی۔ توقع ہے کہ آنجناب وقت نکال کر اُن کے فراہم کردہ مواد کی ضرور جانچ پڑتال کر کے مسلکِ اعتدال واضح فرمائیں گے۔

جواب :۔ گرامی نامہ ملا۔ رابطہ قائم رکھنے پر شکر گذار ہوں اور اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتا ہوں کہ وہ آپ کے تحریکی جذبے میں ترقی فرمائے۔ آمین۔

علامہ ابوالخیر اسدی کی علمی آرا کا مطالعہ کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ ہم اس طرح کی فلسفیانہ بحثوں میں نفیاً اثباتاً اُلجھنے کے قائل نہیں۔ حقیقتِ محمدیہ، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت بالذات اور دوسرے انبیاء کی نبوت بالعرض۔ ختم نبوت مرتبی اور زمانی کی کسی ایک تعبیر و تشریح کو فیصلہ کن اور اصل قرار دے کر اس کی تائید و تردید میں لگ جانا، ہمارے نزدیک تضیعِ اوقات ہے۔ اِن اصطلاحات سے ہٹ کر مثبت انداز میں اسلامی افکار و نظریات کی اشاعت کی جا سکتی ہے۔ آپ "حقیقتِ محمدیہ" کی اصطلاح کو زیر بحث لائے بغیر بھی کہہ سکتے ہیں کہ "یہ کائنات اپنی خلق اور بقا میں اللہ تعالیٰ کی محتاج ہے اور یہ کہ اللہ کی طرف اس احتیاج میں دوسری مخلوق کی طرح خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی شامل ہیں...." "نبوت بالذات اور بالعرض" کا حوالہ دیئے بغیر تمام انبیاء پر ایمان اور "لا نفرق بین احد من رسلہ" کے عقیدہ کی دعوت و تبلیغ کی جا سکتی ہے۔ ختم نبوت مرتبی اور زمانی کی بحث میں اُلجھے بغیر کہا جا سکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قیامت تک کے لیے کوئی نبی مبعوث نہیں ہو گا۔

---

[۱] جہاں تک میرا تعلق ہے، آپ نے مجھ سے خط میں ان کا ذکر کیا مگر نہ کوئی مواد بھیجا، نہ اُن کا پتہ لکھا۔ (ن۔ ص)

جب حقیقتِ محمدیہ ختم نبوت "مرتبی" اور "زمانی" کے ارباب اصطلاح خود اس بات کا دعویٰ نہیں کرتے کہ کائنات اپنی بقا میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی محتاج ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی آسکتا ہے تو آپ ان اصطلاحات سے ان مفاہیم کو ان پر اپنی تحقیق کی بنیاد پر کیونکہ لازم کرتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ آپ کی تحقیق کے مطابق یہ اصطلاحات ان مفاہیم کو مستلزم ہوں اور ان کے قائلین کی تحقیق کے مطابق یہ ان مفاہیم کو مستلزم نہ ہوسکیں، یا مستلزم نہ ہوں۔ ——— البتہ ہدایت و گمراہی کا مدار بنائے بغیر علمی بحث کے طور پر ہر عالم حق رکھتا ہے کہ وہ ان اصطلاحات کے بارے میں اپنی ایک رائے پیش کرے اور اسے علمی دائرہ تک محدود رکھتے ہوئے اپنی رائے کو دعوت و تبلیغ کا مسئلہ نہ بنائے۔

مطبوعات

درس ترمذی جلد ۲ از جناب مولینا محمد تقی عثمانی ۔ مرتبہ مولینا رشید اشرف سیفی ۔

ناشر: مکتبہ دار العلوم ۔ کراچی نمبر ۱۴ ۔ بڑے سائز کے ۶۶۶ صفحات، کتابت و طباعت اچھی، جلد مضبوط، سنہری ڈائی ۔ قیمت: ۶۵/- روپے ۔

ترمذی شریف مشہور مجموعہ احادیث ہے ۔ اس کتاب میں احادیث کے متعلق جامع درسی تقاریر جمع ہیں جن کا تعلق ابواب الصلوٰۃ، ابواب الوتر، ابواب العیدین، ابواب السفر، ابواب متفرقہ، ابواب الزکوٰۃ اور ابواب صوم سے ہے ۔ میں نے اس کتاب کے کئی حصے پڑھے اور احادیث سے حنفی نقطۂ نظر کے مطابق فقہی مسائل کے استخراج کے لیے وسیع مطالعہ و کاوش کا اندازہ کیا ۔ کسی بھی دوسرے امام فقہ کے پیروؤں کی طرح حنفی فقہ کے مسائل کے استنباط کے لیے بھی ایک ایک حدیث کو اس حیثیت سے زیر بحث لانا پڑتا ہے کہ آیا روایت صحیح ہے یا نہیں؟ کسی دوسری مسلّمہ صحیح روایت سے ایسا ٹکراؤ تو نہیں رکھتی کہ پایۂ اعتبار سے ساقط ہو جائے؟ کوئی دوسری نص اسے منسوخ تو نہیں کرتی؟ اس کی تائید میں دیگر احادیث کے علاوہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عملی نمونہ کیا ثابت ہوتا ہے؟ صحابہ کی اختیار کردہ تعبیر کیا ہے اور ان کا طریق معمول بہا کیا تھا؟ وغیرہ ۔ اس لحاظ سے اگرچہ ہر امام فقہ کے پیرو اپنے اپنے اختیار کردہ مسالک و مسائل کی طرف بڑی کھینچ تان سے کام لیتے ہیں اور بیک وقت کسی معاملے میں ایک سے زیادہ طریقہ ہائے سنت کو بھی نہیں مانتے اور سنت و احادیث کی تشریحات و تاویلات میں بھی اپنے طرز پہ اصرار کرتے ہیں ۔ اس خاص تجزیہ سے ہٹ کر اگر دیکھا جائے تو تقی عثمانی صاحب نے دینی علم کا بہت سا ذخیرہ اور احادیث کا بہت سا سرمایہ اور استدلال

کا خاصا اسلحہ خانہ اس کتاب میں جمع کر دیا۔ بالیقین اس کا مطالعہ فہم دین اور خصوصاً فہم فقۂ حنفی میں دینی اساتذہ اور طلبہ کے لیے بہت مفید ثابت ہو سکتا ہے اور عام دینی مطالعہ کے شائقین کے لیے بھی یہ ایک اچھا تحفہ ہے۔ کتاب اپنی قیمت کے لحاظ سے بہت ارزاں ہے۔

القاموس الفرید تالیف مولینا وحید الزمان کیرانوی۔ ترجمہ و تصحیح از مولینا عبدالحق الندوی و مولینا محمد یار راضی (دو مزید اصحاب کی معاونت بھی شامل ہے)۔ ناشر: صابری دارالکتب، چوک اردو بازار، لاہور۔ عام سائز کے صفحات: ۹۶۰۔ سفید کاغذ پر اچھی لکھائی چھپائی۔ قیمت: ۴۵/- روپے

یہ لغت کی کتاب ہے جس میں اردو الفاظ کے بالمقابل عربی الفاظ دیے گئے ہیں۔ مترجمین کے علاوہ عربی میں لکھنے والوں کو بھی اس کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔ خصوصاً طلبائے زبانِ عربی کے لیے اس کی قدر و قیمت بالکل واضح ہے۔

برادرم راضی صاحب نے یہ کتاب مجھے ہدیتہً دی، مگر میں نے مناسب سمجھا کہ اس کا تعارف کرا دوں۔ راضی صاحب کا اپنا پتہ یہ ہے: مولانا محمد یار راضی، بیت راضی، ۲۲۷ محمدی سٹریٹ نیو سمن آباد لاہور

جوہر تقویم جناب ضیاء الدین لاہور۔ ناشر: الحقائق، آصف بلاک۔ علامہ اقبال ٹاؤن لاہور آفسٹ پیپر پر اچھی طباعت۔ صفحات: ۱۱۸۔ قیمت: ۱۵/- روپے۔

یہ کتاب ڈاکٹر سید محمد عبداللہ کے تعارفی کلمات سے شروع ہوتی ہے اور اس کتاب کو ادارۂ تحقیقات اسلامی نے بھی سراہا ہے اور اس کا ایڈیشن نکالنے پر غور کیا ہے۔ پہلے ہمارے پاس صرف وسٹنفلٹ کے اخذ کردہ اصولوں پر مبنی چند تقویمی کتب تھیں، جن سے ہجری تاریخوں سے عیسوی تاریخیں معلوم کی جا سکتی تھیں۔ ایسی ایک تقویم انجمن ترقی اردو کی شائع کردہ بھی ہے۔ ضیاء الدین صاحب نے بڑی محنت کر کے عیسوی تاریخوں کے بالمقابل ہجری تاریخیں دریافت کرنے کا طریقہ نکالا۔ پھر پیچھے کے ہزاروں سال سے لے کر ۱۵۰۰ھ تک کسی بھی عیسوی یا ہجری تاریخ کا دن معلوم کرنے اور کسی بھی دن کے مقابلے میں کسی زمانے کی

کسی خاص تاریخ کو برآمد کرنے کے لیے بھی حسابی کاوشوں سے راستہ نکالا۔ جو ہر تقویم میں انہوں نے ایسی جدولیں بنا دی ہیں کہ ان سے فائدہ اُٹھانے کے آسان سے طریقے کو پڑھ کر سمجھ لیا جائے تو پھر مطلوبہ تاریخ یا دن عیسوی یا ہجری کیلنڈر کے کسی بھی سال اور مہینے میں معلوم کیا جا سکتا ہے اور ایک کیلنڈر کی تاریخوں اور دنوں کے بالمقابل دوسرے کیلنڈر کی تاریخوں اور دنوں کو سامنے لایا جا سکتا ہے۔

پھر ضیاء الدین لاہوری کا یہ بھی ایک اور کارنامہ ہے کہ عہدِ نبوی کی تقویم کو انہوں نے بطورِ خاص مرتب کیا ہے، کیونکہ تاریخ نویسوں اور سیرت نگاروں کو اس کی شدید ضرورت ہے۔

ان خوبیوں کی وجہ سے یہ کتاب صحافیوں، معلموں، طلبہ، مورخین، سیرت نگاروں اور اہلِ علم و تحقیق کے لیے بہت مفید ہے۔

MUSLIMS IN THE WEST	جناب سیّد ابوالحسن علی ندوی - ترجمہ اُردو سے انگریزی از جناب آصف قدوائی - تجدید ترجمہ از ڈاکٹر زیڈ - جے - قریشی -

مدیر مرتب: جناب خرم جاہ مراد، ڈائرکٹر جنرل اسلامک فاؤنڈیشن، ۲۳ لنڈن روڈ لائسٹر (LE2 IZE) انگلینڈ۔

اساسی طور پر یہ کتاب مولانا ابوالحسن ندوی کی تین تقاریر کا مجموعہ ہے جو انہوں نے امریکہ، کینیڈا، انگلینڈ اور جرمنی وغیرہ میں کیں۔ یہ کتاب انہی کا ترجمہ ہے۔

افسوس ہے کہ اتنی اچھی کتاب کے مندرجات پر تفصیلی بحث کرنا ممکن نہیں۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک طرف اس میں دورِ ماضی کی اسلامی قوت اور مغرب کی تاریخ پر نظر ڈالی گئی۔ دوسری طرف دورِ حاضر میں ان مسلمانوں کا تذکرہ ہے۔ جن کی تعداد یورپ و امریکہ میں اتنی ہے کہ اب یہ کہا جا سکتا ہے کہ دیارِ مغرب کا دوسرا بڑا مذہبی گروہ یہی وابستگانِ اسلام ہیں۔ ندوی صاحب نے اہلِ مغرب کی ان مادّی ترقیات کا بھی ذکر کیا ہے جن کے ماحصل کے وہ خود غلام بن کر رہ گئے ہیں اور ساتھ ہی مسلمانوں کو ان کی اصل ذمہ داری کا احساس دلایا ہے کہ ان پر اسلام کی طرف سے یہ ذمہ داری عاید ہوتی ہے کہ مغرب پیغامِ انبیاء کی جس نعمت کا پیاسا رہ گیا ہے،

اس کے سرچشمے کا دہانہ اُن کے لیے کھول کر ان کو سیراب کریں۔ پھر خود مسلمانوں کو ان کے دوگونہ فرائض کا احساس دلایا ہے کہ ایک تو انہیں اپنے آپ کو اور اپنے گھروں اور بچوں کو مغربیت کی رَو میں بہ جانے سے بچانا ہے اور یہ کام بڑی محنت چاہتا ہے، دوسرے انہیں اپنے آپ اُس تعلیم کی شمع کو اہلِ مغرب کے دلوں میں روشن کرنا ہے جس کے اختیار کیے بغیر ان تباہ کُن اُلجھنوں کا کوئی حل نہیں ہے، جن میں جدید ترقی یافتہ انسان اُلجھ گیا ہے۔ کام کا یہ دوسرا حصّہ دو وجوہ سے بہت کمزور رہا ہے۔ اوّلاً یہ کہ اسلام اور مسلمانوں اور مشرق کے متعلق جتنی علمی وتحقیقی خدمات (چاہے اس کی بنیادیں غلط اور اس کی فکری رُوح بھٹکی ہوئی کیوں ہو) مغرب نے انجام دی ہیں، اتنا کام مغرب کے متعلق مسلمان نہیں کر سکے، ثانیاً یہ کہ اسلام کا پیغام کتنا ہی نورانی کیوں نہ ہو، مسلمانوں کی انفرادی بے عملی کے علاوہ مسلم اقوام کے اجتماعی ڈھانچے اُس سے متصادم ہیں جو اصل پیغام کے سرچشمے تک دلوں اور دماغوں کو پہنچنے ہی نہیں دیتے۔ پھر اس کتاب سے مغرب میں بسنے والی مسلمانوں کی سب سے بڑی اقلیت کو مثبت طور پر رہنمائی دی گئی ہے کہ انہیں کیا کرنا چاہیے۔

یہ کتاب مزاج کے اعتبار سے علمی ہے، ترجمہ کی زبان معیاری ہی نہیں، بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مولینا ندوی نے گویا اپنی باتیں انگریزی ہی میں کہی ہیں۔ کاغذ، ٹائپ وطباعت اور ٹائٹیل سب بہترین مغربی معیار کے ہیں۔ افسوس ہے کہ قیمت کا اندراج مجھے نہیں مل سکا۔

مصداقِ بشارت احمدؐ تالیف: چوہدری محمد سرفراز خاں صاحب۔ کالرہ کلاں ضلع گجرات

قیمت: نامعلوم

چوہدری محمد سرفراز خان ہمارے حلقے کے جانے پہچانے صاحب علم وقلم ہیں۔ اور ان کا تذکرہ وقتاً فوقتاً "مطبوعات" میں آتا رہتا ہے۔ پیشِ نظر کتاب میں سورۂ صف کی کامل تفسیر اس بات کے ثبوت کے لیے درج کی گئی ہے کہ مرزا غلام احمد کی نبوت ایک کاذبانہ دعویٰ ہے، مگر دلچسپ صورت یہ ہے کہ ساری کتاب ایک طویل خط وکتابت پر مشتمل ہے جو مرزا بشیر الدین محمود سابق امیر جماعت احمدیہ قادیان ضلع گورداسپور سے ۵ راگست ۱۹۳۷ء کو شروع ہوئی، سائل کے

سوالات اور مجیب کے جوابات نہ صرف دلچسپی کا ذریعہ بنتے ہیں، بلکہ اُن کے مطالعہ سے ایک طرف اسلام کی صداقتوں کے متعلق علم میں اضافہ ہوتا ہے اور دوسری طرف نبوتِ کاذبہ کے پائے چوبیں کی لغزشیں واضح ہو جاتی ہیں۔

مؤلف نے اسی خط و کتابت میں اُصولِ تفسیر، اُصولِ حدیث اور اُصولِ فقہ پر ایسی جامع اجمالی بحث کی ہے کہ ایک عامی کے لیے چند صفحات کے پڑھ لینے سے دین کا پورا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ اسی طرح ص ۱۴ سے آیات بہ سلسلہ ختمِ نبوّت کو مع تفسیر درج کرکے مؤلف نے بڑی خدمت انجام دی ہے۔ پھر سورہ صف کی تفسیر بیان کرتے ہوئے " مُبَشِّرًاۢ بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُہٗٓ اَحْمَدُ " پر خوب دل کھول کر بحث کی ہے اور مختلف تفاسیر کا حوالہ دیا ہے۔ اس آیت سے مرزا صاحب اور اُن کے عقیدت مند یہ مفہوم نکالتے ہیں کہ یہاں احمد سے مراد (نعوذ باللہ) مرزا غلام احمد قادیانی ہیں۔ اس سلسلے میں سورہ کے پورے ربط کلام کو سامنے لاکر چوہدری سرفراز خاں صاحب نے قادیانی دجل و تلبیس کے پرزے اُڑا دیئے ہیں۔

بہرحال میری رائے میں اس کتاب میں قادیانیت کے متعلق جو بحث ہے، اس سے قطعِ نظر بہت سے حقائقِ دینیہ کو ایک عام قاری اخذ کر سکتا ہے۔

اعتذار: تبصرے کے لیے کتابیں بہت ہیں اور جگہ کم نکل سکتی ہے۔ (ادارہ)

تفہیم القرآن

جلد چہارم

جو کہ ایک عرصے سے ختم ہو چکی تھی۔ اب دوبارہ چھپ چکی ہے۔ قارئین کرام اپنے آرڈر پیشگی بک کرا سکتے ہیں۔

ادارہ
ترجمان القرآن لمیٹڈ
۵۔اے ذیلدار پارک، اچھرہ
لاہور

رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۴۰

مارچ ۱۹۸۴ء

INDISPENSABLE BOOK FOR

JUDGES, ADVOCATES, ULAMA AND LAW STUDENTS

THE RECONSTRUCTION OF LEGAL THOUGHT IN ISLAM

Comparative study of the Islamic and the Anglo-American Systems of Law, and refutation of the Orientalists

(Revised and Enlarged Edition)

By

Dr. RIAZUL HASAN GILANI

FOREWORD

SYED ABUL A'LA MAUDOODI

Price : Rs. 50/-

IDARA TARJUMAN AL-QURAN

ICHHRA LAHORE